قائداعظم اور رتی جناح کے ایک ذاتی دوست کی یادداشتیں



کانجی دوارکاداس

جناح، رتی اور میں



ترجمہ: شہاب الدین دسنوی، عقیل عباس جعفری

تعارف، ترتیب نو اور حواشی: عقیل عباس جعفری

نادر و نایاب کتاب "رتی جناح: دی اسٹوری آف اے گریٹ فرینڈشپ" کے مکمل متن کے ساتھ

کانجی دوارکاداس

جناح، رتی اور میں

قائداعظم اور رتی جناح کے ایک ذاتی دوست کی یادداشتیں

''رتی جناح: دی اسٹوری آف اے گریٹ فرینڈشپ'' کے مکمل متن کے ساتھ

ترجمہ:

شہاب الدین دسنوی

عقیل عباس جعفری

تعارف، ترتیب نو اور حواشی:

عقیل عباس جعفری

قانونی مشیر: قادر خان لاء ایسوسی ایٹس، کراچی۔

کمپوزنگ / لے آوٹ ڈیزائننگ: برکت علی

اشاعت اوّل: ستمبر 2011ء۔

قیمت: =/350 روپے۔

اہتمام اشاعت: پبلی کیشنز،

1/94، 26ویں اسٹریٹ فیز 6، ڈی ایچ اے، کراچی

فون: 092-21-35346028

ای میل: virsapublications@gmail.com

طابع: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ،

F-42، حب ریور روڈ، سائٹ، کراچی۔

تقسیم کار: فضلی بک سپر مارکیٹ۔

507/3، ٹمپل روڈ، اردو بازار، کراچی۔

آئی ایس بی این: 978-969-9454-08-0



احمد سلیم کے نام

اردو کے ممتاز محقق احمد سلیم کا پورا نام محمد سلیم خواجہ ہے اور وہ 26 جنوری 1945ء کو گجرات کے گاؤں میانہ گوندل میں پیدا ہوئے۔

احمد سلیم ترقی پسند ادبی تحریک کے انتہائی فعال اور مخلص کارکنوں میں شامل ہیں اور وہ اس تحریک کے صف اوّل کے اہل قلم میں شمار کیے جاتے ہیں۔

انہوں نے جنرل یحییٰ خان کے دور میں قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کی۔ وہ عملی صحافت سے بھی وابستہ رہے اور گزشتہ 15 برس سے اسلام آباد کی ایک غیر سرکاری تنظیم سے وابستہ ہیں۔ احمد سلیم شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے سیاست کے موضوع پر بے شمار کتابیں تحریر کی ہیں۔ وہ 95 سے زیادہ کتابوں اور 25 تحقیقی مقالوں کے مصنف ہیں۔ ان کی شاعری کے مجموعوں میں نور منارے، کونجاں موئیاں، گھڑی دی ٹک ٹک، جب دوست نہیں ہوتا اور اک ادھوری کتاب دے بے ترتیب ورق شامل ہیں۔ انہوں نے نال میرے کوئی چلے اور تتلیاں تے ٹینک کے نام سے دو ناول بھی تخلیق کیے ہیں۔ انہوں نے سیاست کے موضوع پر جو کتابیں تحریر کی ہیں ان میں ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں، سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں، پاکستان اور اقلیتیں، حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ اور پاکستان کے سیاسی قتل کے نام سرفہرست ہیں اس کے علاوہ انہوں نے فیض احمد فیض، حمید اختر، مسعود کھدر پوش، احمد راہی اور کئی دوسرے اہل قلم پر کتابیں بھی قلم بند کی ہیں۔

حکومت پاکستان نے 14 اگست 2010ء کو انہیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا ہے۔ حکومت بنگلہ دیش نے بھی انہیں 1971ء میں بنگلہ دیش کی آزادی کی جدوجہد میں بنگلہ دیشی عوام کا ساتھ دینے پر بنگلہ دیش کا اعلیٰ شہری اعزاز بنگلہ دیش فریڈم ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں رائٹرز گلڈ ایوارڈ، پنجابی ادبی سنگت ایوارڈ، گرورام سنگھ آزادی ایوارڈ، مسعود کھدر پوش ایوارڈ اور پاکستان ٹیلی وژن کے بہترین دستاویزی پروگرام نگار کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ وہ اسلام آباد میں مقیم ہیں۔

کیا جناح پاکستان چاہتے تھے؟

"میں سمجھتا ہوں کہ جناح پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ 1946ء تک وہ متحدہ ہندوستان کے لیے کام کرنے پر تیار تھے۔ میرے خیال میں وہ پاکستان کا مطالبہ پیش کر کے مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اگر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کانگریس لیڈران سے کوئی سمجھوتا کرنا نہیں چاہتے تھے تو اس میں حق بجانب تھے۔ جب کبھی کانگریسی رہنماؤں نے یہ دیکھا کہ برطانیہ سمجھوتے پر آمادہ ہو رہا ہے تو ان کے ذہن میں جناح کو نظر انداز کر دینے کا خیال فوراً آجاتا تھا۔ کانگریس لیڈر سمجھتے تھے کہ ہندو مسلمان مسئلے کو کانگریس جناح اور مسلم لیگ نہیں بلکہ صرف کانگریس اور برطانیہ حل کر سکیں گے۔

ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ بھارت اور پاکستان دو مملکتیں بن گئیں۔ جناح نے پاکستان نہیں جیتا ... کانگریس لیڈر نہرو اور پٹیل جناح کو پاکستان ہار بیٹھے۔"

(زیر نظر کتاب سے ایک اقتباس۔ صفحہ 113)

تعارف

یہ 1996ء کی بات ہے جب لاہور میں برادرم احمد سلیم نے میری توجہ کانجی دوآرکاداس کی ایک کتاب محمد علی جناح کی جانب مبذول کروائی۔ اس وقت میری کتاب قائداعظم کی ازدواجی زندگی شائع ہو چکی تھی اور احمد سلیم کانجی دوآرکاداس کی شخصیت سے میری دلچسپی سے بخوبی واقف تھے جن کی کتاب ''رتی جناح، اسٹوری آف اے گریٹ فرینڈ شپ'' میری کتاب کا بنیادی ماخذ تھی۔

کانجی دوآرکاداس کی کتاب محمد علی جناح ان کے ان اقتباسات کا مجموعہ تھی جو انہوں نے اپنی دو کتابوں India`s Fight for Freedom اور Ten Years to Freedom میں قائداعظم محمد علی جناح کے حوالے سے تحریر کیے تھے۔ کانجی دوآرکاداس کے ان اقتباسات کو سید شہاب الدین دسنوی نے کانجی کی خصوصی اجازت کے بعد یکجا کیا تھا اور یوں قائداعظم کی شخصیت پر ایک نئی کتاب تیار ہو گئی تھی۔

برادرم احمد سلیم نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کتاب میں ''رتی جناح، اسٹوری آف اے گریٹ فرینڈ شپ'' کا ترجمہ بھی شامل کر کے اسے ایک مزید نئی کتاب کی شکل دے دوں تاکہ قائداعظم اور رتی جناح دونوں کے حوالے سے کانجی دوآرکاداس کی تمام تحریریں، ایک ہی کتاب کی صورت میں جمع ہو جائیں، میں نے نہ صرف احمد سلیم کے اس مشورے پر عمل کیا بلکہ کانجی دوآرکاداس کی ایک اور کتاب Gandhiji:Through My Diary Leaves سے بھی ایسے اقتباسات تلاش کر کے اس نئی کتاب میں شامل کر لیے جن میں قائداعظم کا ذکر موجود

تھا۔ آخرالذکر کتاب کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ یہ غالباً دنیا کی واحد کتاب ہے، جس کا انتساب رتی جناح کے نام ہے۔

شہاب الدین دسنوی نے کانجی دوآرکاداس کی تحریروں سے جو کتاب ''محمد علی جناح'' کے نام سے مرتب کی تھی، مجھے اس میں بعض تاریخی تسامحات بھی نظر آئے۔ یہ تسامحات جہاں جہاں موجود تھے، میں نے انہیں اپنے حواشی کے ذریعہ دور کر دیا۔

کانجی دوآرکاداس کی یہ کتاب، ایک ہندو یا کانگریسی رہنما کی تحریر نہیں ہے بلکہ بابائے قوم کے ایک ایسے دوست کی یادداشت ہے جو تقریباً تیس برس تک ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ اس نے اپنی ان یادداشتوں میں بڑی دردمندی سے ان عوامل کا جائزہ لیا ہے جو ہندوستان کی تقسیم اور قیام پاکستان پر منتج ہوئے۔ اس نے بار بار لکھا ہے کہ ہندوستان ٹوٹنے کے ذمہ دار قائداعظم نہیں تھے بلکہ گاندھی، نہرو، پٹیل اور وہ دوسرے انتہا پسند ہندو تھے جنہوں نے مسلمانوں کے لیے پاکستان کے علاوہ اور کوئی راستا چھوڑا ہی نہیں تھا۔

کتاب کے ضمیمہ اوّل میں، میں نے شہاب الدین دسنوی کی خودنوشت سوانح عمری دیدہ و شنیدہ میں شامل کانجی دوآرکاداس کا ایک انٹرویو بھی شامل کیا ہے، اس انٹرویو میں یہ بات بے حد چونکانے والی ہے کہ رتی جناح کی موت قدرتی نہیں تھی بلکہ انہوں نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی تھی اور اپنی موت کے لیے انہوں نے اپنی سالگرہ کا دن منتخب کیا تھا۔ کتاب کے ضمیمہ دوم میں، میں نے کانجی دوارکاداس کی نادر کتاب ''رتی جناح: دی اسٹوری آف اے گریٹ فرینڈشپ'' کا اصل مسودہ بھی کتاب کا حصہ بنا دیا ہے تاکہ کتاب اہمیت میں مزید اضافہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ ضمیمہ سوم میں قائداعظم کے نام لکھے گئے کانجی کے چار نایاب خطوط شامل ہیں، جن کی فراہمی کے لیے میں اپنے عزیز دوست شاہد رضا اور قائداعظم اکیڈمی، کراچی کے لائبریرین عبدالماجد فاروقی کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ یہ کتاب میرے اشاعتی ادارے ورثہ کے اہتمام میں شائع ہو رہی ہے۔ امید ہے یہ کتاب بھی اس ادارے کی دیگر کتب کی طرح آپ کے جمالیاتی ذوق پر بھی پوری اترے گی۔

عقیل عباس جعفری

پیش لفظ

برصغیر ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان، دو آزاد مملکتوں کے وجود میں آنے کی کئی روداد یں انگریزی میں لکھی جا چکی ہیں اور نہ جانے اور کتنی لکھی جائیں گی۔ اس سیاسی ڈرامے کے کچھ ناظرین ابھی تک زندہ ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے اس میں خود بھی چھوٹا بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ان لوگوں کے قلم سے نکلی ہوئی داستانیں، سیاسی شخصیتوں کے سوانح نگاری کے لیے نہیں بلکہ ایک مؤرخ کے لیے بھی بیش قیمت دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہی میں ایک دلچسپ اور اہم داستان کانجی دوآرکاداس کی لکھی ہوئی India`s Fight for Freedom ہے۔ یہ کتاب 1966ء میں شائع ہوئی۔ اسی موضوع سے متعلق مصنف کی دوسری کتاب Ten Years to Freedom 1968ء میں شائع ہوئی۔ پہلی کتاب میں 1913ء سے 1937ء تک اور دوسری میں 1938ء سے 1947ء تک کے واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔

میں نے پہلی کتاب پڑھنی شروع کی تو اس وقت تک اس کے مصنف کانجی دوآرکاداس اور قائداعظم محمد علی جناح کے گہرے ذاتی تعلقات کا مجھے علم نہ تھا۔ کانجی دوآرکاداس، قائداعظم کے نہایت عزیز دوست تھے۔ انہوں نے قائداعظم کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اس لیے جو باتیں انہوں نے لکھی ہیں ان میں سے، بہت سے لوگوں کے لیے، بعض باتیں بالکل نئی ہوں گی۔ اسی بنا پر مجھے خیال آیا کہ اگر ان ساری باتوں کو جو قائداعظم کے بارے میں ان دو کتابوں کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، یکجا کر کے مرتب کر لیا جائے تو قائداعظم کی شخصیت کے کچھ نئے زاویے سامنے آ جائیں گے اور یہ مواد مستقبل کے سوانح نگار کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ مصنف سے ملاقات

کر کے میں نے یہ خیال ان کے سامنے پیش کیا۔ وہ خوش ہوئے اور ترجمہ اور ترتیب، دونوں کی اجازت دے دی۔ اس وقت تک ان کی دوسری کتاب شائع نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود انہوں نے اس کا مسودہ میرے حوالے کر دیا تا کہ میں اس میں سے بھی مواد حاصل کرسکوں۔

کانجی دوآرکاداس نے قائداعظم اور مہاتما گاندھی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے کچھ حصوں سے بعض لوگوں کو اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ایک تبصرہ نگار کا کہنا ہے: ''ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ماضی قریب کا جائزہ، تاریخی انداز اور تنقیدی شعور کے ساتھ لیا کریں یعنی واقعات کو واقعات کی شکل میں پیش کریں''۔ اس لحاظ سے مصنف نے دیانت داری اور بے باکی سے کام لیا ہے۔ خود مصنف کا کہنا ہے: ''میں ہر بات صاف صاف لکھتا ہوں، نہ کسی کو خوش کرنے کی خاطر نہ کسی کو ناراض کرنے کے لیے''۔ اپنی کتابوں کے لیے مصنف کو وہ یادداشتیں اور نوٹس بہت کام آئے جو وہ اپنی عادت کے مطابق ہر ہفتہ لکھتے رہے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے مجھے بتایا، ان کے پاس ایسے کاغذات کی تقریباً تین سو فائلیں تھیں جو انہوں نے امریکا کی پن سلوینیا یونیورسٹی کے کتب خانے کو دے دی ہیں۔

تاریخ یوں تو حادثات ہی سے بنتی ہے لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، جب بھی اس ملک کی سیاست نے موڑ لیا تو ہمیشہ ایسے مقام پر جہاں سے دو راستے نکلتے تھے۔ جو راہ چھوٹ گئی اگر وہ اختیار کر لی جاتی تو ملک کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا مطالعہ کرنے والوں کو اس حقیقت کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے۔ اس کتاب میں بھی مسلم لیگ، کانگریس، ہوم رول لیگ، گاندھی، جناح، پٹیل اور نہرو کے ذکر میں بار بار'' کاش ایسا ہوتا'' یا '' کاش یہ نہ ہوتا'' کی آواز اٹھتی ہے اور یہ آواز بڑی بامعنی ہو جاتی ہے۔

کانجی دوآرکاداس نے اپنی کتابوں میں'' قائداعظم'' کو صرف'' جناح'' لکھا ہے۔ انگریزی رواج کے علاوہ ان کو ایسا لکھنے کا حق بھی پہنچتا ہے۔ ترجمے میں بھی اس بے تکلف طریقہ تخاطب کو برقرار رکھا گیا ہے۔

شہاب الدین دسنوی

ترتیب

تعارف ---------- 5
پیش لفظ ---------- 7
آغاز دوستی ---------- 13
رومان اور شادی ---------- 14
ابتدائی زندگی ---------- 14
کردار کی خصوصیات ---------- 15
وفد کی نمائندگی ---------- 15
سخت مزاجی ---------- 16
سروجنی نائیڈو ---------- 17
کانگریس کے جلسے میں ---------- 18
تفریحی مشغلے ---------- 18
ہوم رول لیگ ---------- 18
گجراتی میں تقریر ---------- 19
مسز بیسنٹ کی رہائی کی کوشش ---------- 19
رتی ---------- 19
رتی کی قوم پرستی ---------- 20
جیسا دیس ویسا بھیس ---------- 21
برجستگی ---------- 21
دینا ---------- 22
رولٹ ایکٹ ---------- 22
ہوم رول لیگ کا وفد ---------- 23
مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ ---------- 23
شرربار تقریر ---------- 24
سپاسنامہ پر اعتراض ---------- 24
ہنگامہ ---------- 25
جناح ہال ---------- 25
دو ہوم رول لیگ ---------- 26
گاندھی جی لیگ کے صدر ---------- 26
سودے بازی ---------- 30
علیحدگی ---------- 30
گاندھی جی کی کامیابی ---------- 31
گول میز کانفرنس ---------- 31
جناح کی پریشانی ---------- 32
نئی پارٹی ---------- 33
جناح اور موتی لال نہرو ---------- 33
اسمبلی میں سرگرمیاں ---------- 34
سوراج پارٹی کا تعاون ---------- 35
ووٹ کی قیمت ---------- 35
1924ء سے 1929ء تک ---------- 36
جناح کی وصیت ---------- 39
افواج کی ہندوستانیت ---------- 39
اصلاحی کارروائیاں ---------- 40

بے نظیر انتخاب ——— 40
مخلوط انتخاب ——— 42
تخریبی کارروائی ——— 43
سائمن کمیشن ——— 43
نہرو کمیٹی ——— 43
اقلیت کا مسئلہ ——— 45
نہرو رپورٹ ——— 45
جناح کی تقریر ——— 47
نہرو رپورٹ کا انجام ——— 47
رتی اور میں ——— 48
تصوف ——— 50
انگلستان کا سفر ——— 55
فرصت کے مشاغل ——— 56
جناح اور رتی کی علیحدگی ——— 58
رتی کی بیماری ——— 59
رتی کی وفات ——— 60
رتی کے بعد ——— 61
حزن و تنہائی ——— 62
مزاج میں تبدیلی ——— 62
رتی کی قوم پرستی ——— 63
"بد دماغی" ——— 63
اخلاق اور جرأت ——— 64
گاندھی جی کو ہلانے کا الزام ——— 73
خوش پوش جنٹلمین ——— 74
گول میز کانفرنس کا اعلان ——— 74
اتفاقات یا حادثات ——— 76
کانفرنس میں کیا ہوا؟ ——— 76
پہلی گول میز کانفرنس ——— 77
لندن میں کیا ہوا؟ ——— 78
جناح کا رویہ ——— 80
رشوت کے بعد دباؤ ——— 80
سر فضل حسین کا کارنامہ ——— 81
دوسری گول میز کانفرنس ——— 81
گاندھی جی کی غلطی ——— 82
مخلوط انتخابات، کب اور کیسے؟ ——— 83
جناح کی مقبولیت ——— 83
تیسری گول میز کانفرنس ——— 83
جناح لندن میں ——— 84
علیحدگی کا سبب ——— 84
جناح نے چائے بنائی ——— 85
واپسی کیسے ہوئی؟ ——— 85
ناکامی کی ذمہ داری ——— 86
جناح کی علالت ——— 87
گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ——— 88
ردعمل ——— 88
مفاہمت کی کوششیں ——— 89

1937ء کے انتخابات ---------- 90
وزارت کی دعوت ---------- 90
کھیر اور مسلم وزیر ---------- 91
نہرو کی غلطی ---------- 92
''یوم نجات'' ---------- 92
ہندوؤں پر عدم اعتماد ---------- 92
''ہندوستان چھوڑ دو'' ---------- 93
کانگریس سے شکایت ---------- 94
راجاجی ---------- 94
پاکستان کا تصور ---------- 95
مایوسی اور اضمحلال ---------- 95
راجاجی اور گاندھی جی ---------- 96
کل ہند قیادت ---------- 96
اقتصادی بہبودی ---------- 97
جناح کا قصور کیا تھا؟ ---------- 98
گاندھی کی رہائی کی کوشش ---------- 98
راجاجی، جناح کی نظر میں ---------- 99
طبقاتی کشمکش ---------- 100
لیڈروں کی کم ہمتی ---------- 100
جناح کے نام خط ---------- 100
گاندھی جناح ملاقات ---------- 102
ناکامی کے بعد ---------- 103
نیا بنگلہ ---------- 104
کانگریس سے شکایت ---------- 105
یادداشت میں جناح کا ذکر ---------- 105
امریکا کی دعوت ---------- 106
امریکا کا سفر ---------- 107
لندن میں جناح سے ملاقات ---------- 107
مسلم لیگ کا مطالبہ ---------- 108
تلخی کا سبب ---------- 109
اٹلی سے ملاقات ---------- 109
ولبھ بھائی کا اعتراف ---------- 110
خط کی اہمیت ---------- 111
گاندھی اور جناح کی آخری ملاقات -- 111
3 جون کا اعلان ---------- 112
آخر تقسیم ہوگئی ---------- 112
کیا جناح پاکستان چاہتے تھے؟ ---------- 113
قائداعظم کی تقریر ---------- 113
مستقبل ---------- 114

ضمیمہ جات اور تعارف

1: کانجی دوآرکاداس سے انٹرویو ---------- 115
2: کانجی دوارکاداس کی کتاب ---------- 119
3: کانجی دوارکاداس کے خطوط ---------- 169
کانجی دوآرکاداس (تعارف) ---------- 173
شہاب الدین دسنوی (تعارف) ---------- 174
عقیل عباس جعفری (تعارف) ---------- 175

جس سن میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تھی اسی سال دسمبر میں ''بمبئی پریسڈنسی ایسوی ایشن'' کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جون 1916ء میں اس ایسوی ایشن کا ایک جلسہ ہو رہا تھا جس میں حاضرین کی کل تعداد پچیس تھی۔ دو تین تقریریں ہو چکیں تو چھریرے بدن کا ایک مقرر کھڑا ہوا۔ چیک ڈیزائن کی پتلون اور سیاہ رنگ کا کوٹ پہنے، ایک طرف کو مانگ نکلی ہوئی، چہرے پر مونچھیں...... جب تک یہ شخص بولتا رہا، سب ہمہ تن گوش ہو کر اس کا ایک ایک لفظ سنتے رہے۔ اس کے انداز بیان میں خوش مزاجی تھی، لہجہ صلح کن تھا! مسئلے کو مختلف زاویوں سے پیش کر کے وہ درمیانی راہ نکالنا جانتا تھا۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگا یہ شخص کون ہے؟ پی۔ کے۔ تیلنگ میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا۔ وہ تعجب سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے: ''تم جناح کو نہیں جانتے؟'' میں نے جناح کا نام تو سنا تھا لیکن دیکھا کبھی نہ تھا۔ ان کی عمر اس وقت 40 سال تھی اور وہ بمبئی کے قانونی حلقے میں نام پیدا کر چکے تھے۔ ان کی جرح اور بحث، دونوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ مرکزی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے بھی کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ سیاسی دنیا میں وہ سروجنی نائیڈو کے دیئے ہوئے خطاب ''ہندو مسلم اتحاد کی علامت'' سے پہچانے جاتے تھے اور بعض لوگ انہیں ''مسلمانوں کا گوکھلے'' بھی کہا کرتے تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ''گاندھی یگ'' شروع ہونے سے بہت پہلے، یعنی 1916ء میں جناح اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔

آغاز دوستی

جلسہ ختم ہوا تو تیلنگ نے ان سے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا کہ میں مسز اینی بیسنٹ کی تھیاسوفی

تحریک سے وابستہ ہوں اور سیاست میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ جناح نے بڑے دلآویز انداز سے جھکتے ہوئے، دوستانہ لہجے میں مشورہ دیا کہ اگر سیاست میں حصہ لینا ہو تو مجھے اس میں پورے انہماک اور خلوص کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ نصیحت کے اس فقرے کے ساتھ جناح سے میری دوستی کا آغاز ہوا۔ اس وقت میری عمر صرف 24 سال تھی، ہماری یہ دوستی ستمبر 1948ء تک جاری رہی جب کہ وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوئے!

رومان اور شادی

جس جلسے کا میں نے ذکر کیا اس میں جناح غیر معمولی طور پر مسرور نظر آ رہے تھے۔ بعد از اں اس مسرت کا سبب یہ معلوم ہوا کہ وہ گرمی کی دو مہینوں کی چھٹیاں دارجلنگ میں سر ڈنشا پٹیٹ اور لیڈی پٹیٹ کے ساتھ گزار کر لوٹے تھے اور وہیں اپنے میزبان کی سولہ سالہ بیٹی، رتی کے دام الفت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ جناح کی واپسی پر یہ بات بمبئی میں مشہور ہو گئی۔ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن لڑکی کے والدین رضامند نہ تھے۔ رتی اس عمر کو نہیں پہنچی تھی کہ قانونی طور پر اپنی مرضی سے بیاہ کر لیتی۔ ولی کی حیثیت سے اس کے والدین نے ہائی کورٹ سے ایک امتناعی حکم بھی حاصل کر لیا تھا جس کی رو سے جناح اور رتی کا ملنا ممنوع ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں ان کو انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جس روز (1) رتی کی عمر 18 سال ہوئی، اسی دن اس نے اپنے والدین کے گھر کو خیر باد کہا، اسلام قبول کر لیا اور اس کے بعد جناح سے اس کا نکاح ہو گیا۔ ان دنوں سول میرج کے قانون کے تحت یہ ضروری تھا کہ فریقین پہلے یہ اقرار کریں کہ وہ کسی مذہب کے پیرو نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور قابل لحاظ تھی...... جناح مرکزی اسمبلی کی ایک مسلم نشست کے رکن بھی تھے۔

ابتدائی زندگی

جناح ایک غریب گھرانے میں 25 دسمبر 1876ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کے

---

(1) رتی 20 فروری 1918 کو 18 برس کی ہوئی تھیں، جبکہ انہوں نے 18 اپریل 1918 کو اسلام قبول کیا اور 19 اپریل 1918 کو قائد اعظم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں (م ح ج)

تھے کہ ان کا بیاہ ایک کمسن لڑکی سے کر دیا گیا جس کے فوراً بعد ہی 1892ء (1) میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہ انگلستان روانہ ہو گئے۔ لندن میں وہ اکثر پارلیمنٹ کی کارروائی سننے چلے جاتے تھے۔ 1896ء میں بیس سال کی عمر میں بیرسٹر بن کر کراچی لوٹے لیکن کچھ دنوں بعد بمبئی چلے آئے۔ یہاں انہیں مقدموں کے لیے تین سال اور انتظار کرنا پڑا۔ 1900ء میں وہ عارضی طور پر پریسڈنسی مجسٹریٹ مقرر کیے گئے۔ اب انہوں نے اپنی چھوٹی بہن، فاطمہ کو بھی بمبئی بلا لیا اور باندرہ کے ایک کونونٹ اسکول میں داخل کروادیا۔ جماعت کی طرف اس کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن انہوں نے پروانہ کی۔ جناح ہر اتوار کو گھوڑے پر بیٹھ کر اپنی بہن سے ملنے باندرہ جایا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہیں مستقبل طور پر پریسڈنسی مجسٹریٹ کے عہدے کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ کسی سرکاری ملازمت سے ہمیشہ کے لیے وابستہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں اپنی صلاحیتوں پر اعتماد اور کامیابی کا یقین تھا۔ وہ ایک ہزار روپے ماہانہ پر بمبئی میونسپل کارپوریشن کے قانونی مشیر بھی رہے۔

کردار کی خصوصیات

جناح کی بے مثال ایمان داری کا ہر شخص معترف تھا اور ان کی اس نیک نامی کی شہرت اخیر وقت تک قائم رہی۔ ان کی غیر معمولی ذہانت سے انہیں اپنے قانونی پیشے کے علاوہ سیاسی زندگی میں بھی بے حد مدد ملی۔ ان کا ذہن مسائل کو صاف اور واضح ڈھنگ سے سوچنا جانتا تھا، ان کی طبیعت انصاف پسند تھی۔ اپنے مخالفوں سے مقابلہ کرنے میں ان کی یہ دونوں خصوصیات بہت کام آئیں۔ سیاست کے میدان میں جہاں وہ گاندھی جی کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کا سدباب کر سکے تو دوسری طرف جواہر لال نہرو کی سیماب مزاجی پر بھی قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔

وفد کی نمائندگی

1904ء میں کانگریس کے اجلاس میں ایک تجویز منظور کی گئی کہ ہندوستان کے بارے میں برطانوی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی خاطر ایک وفد انگلستان روانہ کیا جائے۔ سر ولیم ویڈر برن

---

(1)۔ قائداعظم لندن کے سفر پر جنوری 1893ء میں روانہ ہوئے تھے (ع ع ج)

نے، جو انگلستان سے خاص طور پر کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے آئے تھے، اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے وفد کی کامیابی کی تمنا کرتے ہوئے خواہش کی کہ اس کی قیادت سر فیروز شاہ مہتا کریں۔ لیکن وہ نہ جا سکے اور فیصلہ ہوا کہ ہندوستانی وفد میں بمبئی کی نمائندگی گوکھلے اور جناح کریں۔

سخت مزاجی

جناح پر کبھی یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ درشت مزاج واقع ہوئے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی ظاہراً سخت مزاجی ان کی بے پناہ ایمان داری اور کھری طبیعت کا نتیجہ تھی۔ سر چمن لال سیتل واد اپنی کتاب Recollections & Reflections میں لکھتے ہیں:

> ''وکالت کے پیشے میں جناح 1896ء میں داخل ہوئے۔ میں اس زمانے میں مرافعے کے مقدمے لیا کرتا تھا، لیکن جب میں اوریجنل سائڈ پر آیا تو ان سے زیادہ قرب پیدا ہوا۔ پھر تو کئی مقدموں میں ان کے ساتھ بھی کام کیا اور ان کا آمنا سامنا بھی ہوا۔ جناح نے ابتدا ہی سے اپنی بے باکی قائم رکھی تھی۔ وہ کسی بڑے سے بڑے جج یا حریف بیرسٹر سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار اسٹرینگ مین اور جناح ایک مقدمے میں ساتھ پیروی کر رہے تھے۔ جناح مشورے کے لیے اسٹرینگ مین کے چیمبر میں گئے تو اس ملاقات کے دوران میں اسٹرینگ مین نے کچھ اس طرح گفتگو کی کہ جس سے جناح کی ہتک ہوتی تھی۔ پھر اس کے بعد جناح، اسٹرینگ مین کے چیمبر میں کبھی نہیں گئے۔
>
> مجھے عدالت کا ایک اور واقعہ یاد ہے۔ مرحوم جسٹس مرزا کی عدالت میں جناح اور میں فریقین کی جانب سے کام کر رہے تھے۔ اس مقدمے کے سلسلے میں کئی دوسرے وکلا بھی حاضر تھے۔ بحث کے دوران میں جناح نے جج کو کچھ ایسے انداز سے مخاطب کیا کہ انہیں برا لگا۔ جج نے جناح کو

متنبہ کیا کہ وہ توہین عدالت کے مرتکب ہو رہے ہیں پھر جسٹس مرزا نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا مسٹر جناح عدالت کی توہین نہیں کر رہے ہیں؟'' یہ بڑا احمقانہ سوال تھا میں نے جواب دیا اس کا فیصلہ کرنا تو آپ کا کام ہے، میں کیسے کوئی رائے دے سکتا ہوں۔ لیکن مسٹر جناح کو تھوڑا بہت جانتا ہوں اور میں اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں وہ ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس واقعے کے بعد ایک مدت تک جناح جسٹس مرزا کی عدالت میں پیش نہیں ہوئے''۔

سر چمن لال سیتل واد آگے چل کر لکھتے ہیں:

''میں پبلک لائف میں جناح سے بہت قریب ہو گیا تھا۔ برسوں ہم لوگ کانگریس میں ایک ساتھ کام کرتے رہے۔ سائمن کمیشن کے خلاف بمبئی میں ہم دونوں نے مل کر تحریک میں حصہ لیا تھا۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل، انڈین لیجسلیٹو کونسل اور گول میز کانفرنس میں بھی ہم ساتھ رہے۔ ہمارے ذاتی تعلقات ہمیشہ بڑے خوش گوار رہے''۔

سروجنی نائیڈو

مسز سروجنی نائیڈو پہلی بار جناح سے اس وقت ملیں جب کہ بیرسٹری کے پیشے میں کامیابی جناح کے قدم چوم رہی تھی۔ وہ لکھتی ہیں:

''کسی اور شخص کے ظاہری اور باطنی خصوصیات میں اتنا بڑا تضاد نہیں دیکھا گیا جتنا محمد علی جناح کی شخصیت میں تھا۔ بلند قامت، نازک، چھریرا جسم، ان کے جثے کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے اندر کتنا غیر معمولی جذبہ اور کس بلا کا عزم پوشیدہ ہے۔ بہ ظاہر آئین اور دستور کے پابند اور سختی سے ان پر کاربند، ایک حد تک الگ تھلگ، سنجیدہ اور شائستہ..... مگر جو لوگ ان سے واقف تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جناح

نے، جو انگلستان سے خاص طور پر کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے آئے تھے، اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے وفد کی کامیابی کی تمنا کرتے ہوئے خواہش کی کہ اس کی قیادت سر فیروز شاہ مہتا کریں۔ لیکن وہ نہ جا سکے اور فیصلہ ہوا کہ ہندوستانی وفد میں بمبئی کی نمائندگی گوکھلے اور جناح کریں۔

سخت مزاجی

جناح پر کبھی یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ درشت مزاج واقع ہوئے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی ظاہرا سخت مزاجی ان کی بے پناہ ایمان داری اور کھری طبیعت کا نتیجہ تھی۔ سر چمن لال سیتل واد اپنی کتاب Recollections & Reflections میں لکھتے ہیں:

"وکالت کے پیشے میں جناح 1896ء میں داخل ہوئے۔ میں اس زمانے میں مرافعے کے مقدمے لیا کرتا تھا، لیکن جب میں اوریجنل سائڈ پر آیا تو ان سے زیادہ قرب پیدا ہوا۔ پھر تو کئی مقدموں میں ان کے ساتھ بھی کام کیا اور ان کا آمنا سامنا بھی ہوا۔ جناح نے ابتدا ہی سے اپنی بے باکی قائم رکھی تھی۔ وہ کسی بڑے سے بڑے جج یا حریف بیرسٹر سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار اسٹرینگ مین اور جناح ایک مقدمے میں ساتھ پیروی کر رہے تھے۔ جناح مشورے کے لیے اسٹرینگ مین کے چیمبر میں گئے تو اس ملاقات کے دوران میں اسٹرینگ مین نے کچھ اس طرح گفتگو کی کہ جس سے جناح کی ہتک ہوتی تھی۔ پھر اس کے بعد جناح، اسٹرینگ مین کے چیمبر میں کبھی نہیں گئے۔

مجھے عدالت کا ایک اور واقعہ یاد ہے۔ مرحوم جسٹس مرزا کی عدالت میں جناح اور میں فریقین کی جانب سے کام کر رہے تھے۔ اس مقدمے کے سلسلے میں کئی دوسرے وکلا بھی حاضر تھے۔ بحث کے دوران میں جناح نے جج کو کچھ ایسے انداز سے مخاطب کیا کہ انہیں برا لگا۔ جج نے جناح کو

متنبہ کیا کہ وہ توہین عدالت کے مرتکب ہورہے ہیں پھر جسٹس مرزا نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا مسٹر جناح عدالت کی توہین نہیں کررہے ہیں؟'' یہ بڑا احمقانہ سوال تھا میں نے جواب دیا اس کا فیصلہ کرنا تو آپ کا کام ہے، میں کیسے کوئی رائے دے سکتا ہوں۔ لیکن مسٹر جناح کو تھوڑا بہت جانتا ہوں اور میں اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں وہ ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہوسکتے ہیں۔ اس واقعے کے بعد ایک مدت تک جناح جسٹس مرزا کی عدالت میں پیش نہیں ہوئے''۔

سر چمن لال سیتل واد آگے چل کر لکھتے ہیں:

''میں پبلک لائف میں جناح سے بہت قریب ہوگیا تھا۔ برسوں ہم لوگ کانگریس میں ایک ساتھ کام کرتے رہے۔ سائمن کمیشن کے خلاف بمبئی میں ہم دونوں نے مل کر تحریک میں حصہ لیا تھا۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل، انڈین لیجسلیٹو کونسل اور گول میز کانفرنس میں بھی ہم ساتھ رہے۔ ہمارے ذاتی تعلقات ہمیشہ بڑے خوش گوار رہے''۔

سروجنی نائیڈو

مسز سروجنی نائیڈو پہلی بار جناح سے اس وقت ملیں جب کہ بیرسٹری کے پیشے میں کامیابی جناح کے قدم چوم رہی تھی۔ وہ لکھتی ہیں:

''کسی اور شخص کے ظاہری اور باطنی خصوصیات میں اتنا بڑا تضاد نہیں دیکھا گیا جتنا محمد علی جناح کی شخصیت میں تھا۔ بلند قامت، نازک، چھریرا جسم، ان کے جثے کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اس کے اندر کتنا غیر معمولی جذبہ اور کس بلا کا عزم پوشیدہ ہے۔ بہ ظاہر آئین اور دستور کے پابند اور سختی سے ان پر کاربند، ایک حد تک الگ تھلگ، سنجیدہ اور شائستہ...... مگر جو لوگ ان سے واقف تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جناح

کے سینے میں عورت کے دل کی نرمی اور بچے کی معصومیت پوشیدہ ہے، وہ ایک عملی اور عقلیت پسند آدمی تھے"۔

کانگریس کے جلسے میں

دسمبر 1906ء میں جناح پہلی بار کلکتہ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس وقت وہ دادا بھائی نوروجی، صدر کانگریس کے پرائیویٹ سیکریٹری تھے۔ اس موقع پر خطبہ صدارت میں ''سیلف گورنمنٹ'' یا ''سوراج'' کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔

تفریحی مشغلے

جناح بمبئی اورینٹ کلب کے ممبر تھے اور وہاں بلیئرڈ یا شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شطرنج اچھی کھیل لیا کرتے تھے لیکن تاش یا کسی اور قسم کی قمار بازی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ہوم رول لیگ

لکھنؤ کانگریس کے بعد، مسز بیسنٹ کی گرفتاری تک یعنی 16 جون 1917ء تک، سکون تھا۔ جناح خود بھی ہوم رول لیگ میں شریک ہوئے اور اپنے بے شمار ہم پیشہ اشخاص کو بھی اس میں شریک کیا۔ ہوم رول کی شاخیں بمبئی شہر کے مختلف حصوں میں، صوبہ بمبئی اور خاص طور پر گجرات میں قائم کی گئی تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ہر ہفتہ پمفلٹ اور کتابچے شائع ہوتے، بمبئی میں کالبادیوی اور مانڈوی کے علاقوں میں ڈنر پر تقریریں ہوتیں، گرگام میں ہر پندرہویں دن شانتا رام چال میں بڑے بڑے جلسے ہوتے، جن میں جناح، تلک، کھاپرڈے، کھاڈیلکر، کیلکر اور ہارنی مین تقریریں کرتے تھے۔ شانتارام چال کے جلسوں کی خبریں سن سن کر گورنر، لارڈ ویلنگڈن کی نیند حرام ہوئی جاتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے عوام میں سیاسی شعور کے آثار پیدا ہونے لگے۔ یہی صورت حال گجرات کے بعض بڑے بڑے شہروں مثلاً سورت، آنند، احمد آباد اور گودھرا اور ان کے پاس کے اضلاع کی ہوئی۔ ہوم رول لیگ کی پہلی سہ سالہ تحریک نے ایک قومی فضا پیدا کر دی جو آگے چل کر گاندھی جی کی عوامی تحریک کے لیے مفید ثابت ہوئی۔

گجراتی میں تقریر

عمر سوبانی، شنکر لال بینکر اور میں، تینوں مل کر تقریباً ہر روز ہی جناح کے چیمبر میں سیاسی پروپیگنڈے کا پروگرام بنایا کرتے تھے۔ جولائی 1917ء میں گجرات سبھا کی دعوت پر گودھرا میں صوبائی پولیٹیکل کانفرنس ہوئی تھی، جس کے صدر گاندھی جی اور سیکریٹری ولبھ بھائی پٹیل تھے۔ اس جلسے میں صف اوّل کے جن رہنماؤں نے شرکت کی ان میں لوکمانیہ تلک، محمد علی جناح، کھاپرڈے، وٹھل بھائی پٹیل، پٹیٹ اور پی۔ کے۔ تیلنگ شامل تھے۔ ان دنوں ولبھ بھائی پٹیل کا شمار رہنماؤں میں نہیں ہوتا تھا۔ جلسے میں جب جناح تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو گاندھی جی نے اصرار کیا کہ جناح گجراتی میں بولیں۔ ان کی بات مانتے ہوئے جناح نے اپنی تقریر یہ کہہ کر گجراتی میں شروع کی: ''صاحبو' گاندھی جی کے حکم سے میں گجراتی میں بول رہا ہوں۔ تقریر کا پہلا حصہ گجراتی میں ہوگا لیکن اپنی تقریر میں انگریزی میں مکمل کروں گا''۔ اس پر بڑا قہقہہ لگا جس کے بعد جناح نہایت شستہ انگریزی میں چالیس منٹ تک بولتے رہے۔

مسز بیسنٹ کی رہائی کی کوشش

ستمبر 1917ء میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس شملے میں ہوا۔ جناح اس میں شریک ہوئے۔ وہاں انہوں نے تیج بہادر سپرو کے ساتھ مل کر مسز اینی بیسنٹ کی رہائی کی بڑی کوشش کی مگر اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

رتی

یہ فروری 1914ء کی بات ہے۔ میں نے الفنسٹن کالج سے کوئنز روڈ ٹینس کورٹ پر ایک گھوڑا گاڑی آتے ہوئے دیکھی۔ جسے دو چھوٹے چھوٹے گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ اس وقت بمبئی میں موٹر گاڑیوں کی ریل پیل نہیں ہوئی تھی اور سڑکوں پر عام طور پر گھوڑا گاڑیاں ہی چلا کرتے تھیں۔ اس گھوڑا گاڑی میں ایک چودہ سالہ پارسی لڑکی سوار تھی۔ میری نظریں اس لڑکی پر جم گئیں۔ اور جب تک وہ گھوڑا گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی میں اسے دیکھتا رہا۔ تاہم لڑکی کا چہرہ میرے

حافظے میں محفوظ ہو گیا تھا۔ تین ماہ بعد مجھے اخبار میں شائع ہونے والی ایک تصویر سے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام رتی ہے اور وہ سر ڈنشا پیٹٹ کی بیٹی ہے۔ گو اس وقت تک مجھے آواگون کے بارے میں زیادہ علم نہ تھا لیکن مجھے یہی لگا کہ رتی اور میں کسی پچھلے جنم میں بھی ایک دوسرے کے دوست رہ چکے ہیں۔

1916ء اور اس کے بعد جب پہلی عالمی جنگ عروج پر تھی، بمبئی کی مشہور سیاسی کارکن مسز اینی بیسنٹ نے بمبئی اور ملک کے دوسرے حصوں میں سیاسی سرگرمیوں کے ایک سلسلہ کا آغاز کیا۔ بمبئی میں جو اجلاس منعقد ہوتے تھے ان میں ننھی رتی اپنی آنٹی ہما بائی پیٹٹ کے ساتھ ہمیشہ پہلی صف میں نظر آتی تھی۔ مس ہما بائی پیٹٹ کروڑ پتی تھیں اور خدمت خلق کے جذبے سے مالا مال تھیں۔

میں عام طور پر اسٹیج پر مقررین کے پیچھے بیٹھا ہوتا تھا اور جب کوئی مقرر طویل تقریر کرتا تھا یا موضوع سے ہٹنے لگتا تھا تو میں خاموشی سے اس کے گھٹنے کے پیچھے ایک پنسل چبھو دیا کرتا تھا۔ میری اس حرکت سے تقریر کا تسلسل اور خیالات کا بہاؤ ٹوٹ جاتا تھا اور وہ اپنی تقریر ختم کر کے واپس اپنی نشست پر جا بیٹھتا تھا۔ بعد میں جب میں اور رتی دوست بنے تو رتی نے مجھے بتایا کہ وہ میری اس حرکت سے بڑی محظوظ ہوا کرتی تھی۔

دسمبر 1916ء میں مسٹر اور مسز بھولا بھائی ڈیسائی اور ان کے نوجوان بیٹے دھیرو کے ساتھ لکھنؤ گیا۔ جس ٹرین سے ہم سفر کر رہے تھے اس میں ہمارے کمپارٹمنٹ سے اگلے کمپارٹمنٹ میں رتی، ہما بائی پیٹٹ اور بیرسٹر ڈی این بہادر جی (مرحوم) ہمارے ہم سفر تھے۔ جب کوئی بڑا جنکشن آتا تو رتی اور بہادر جی پلیٹ فارم پر ٹہلنے نکلتے میں نے رتی کو دیکھا ضرور مگر اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

اس سے میری پہلی ملاقات 1918ء میں اس کی اور محمد علی جناح کی شادی کے بعد ہی ہو سکی۔

رتی کی قوم پرستی

شادی کے بعد رتی سے میری ملاقاتیں تواتر کے ساتھ ہونے لگی تھیں۔ یہ تقریباً بالعموم ان کے گھر پر رات کے کھانے پر ہوتی تھیں۔ وہ ایک عظیم قوم پرست تھیں اور ملک کی سیاسی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ بعض اوقات ان عشائیوں میں سروجنی نائیڈو بھی شامل ہو جاتیں اور جناح،

جنہیں ہم سب اپنا رہنما تسلیم کرنے لگے تھے تو ایسے موقعوں پر موجود ہوتے ہی تھے۔

رتی بڑی زبردست قوم پرست تھیں۔ میں یہاں ان کے اور لارڈ چیمسفورڈ اور لارڈ ریڈنگ کے درمیان پیش آنے والے دو واقعات کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں جن میں رتی کی قوم پرستی بڑے عروج پر نظر آتی ہے۔

جیسا دیس ویسا بھیس

1918ء میں اپنی شادی کے کچھ عرصہ بعد رتی، جناح کے ہمراہ شملہ گئیں جہاں جناح کو ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنی تھی۔ وہ اور جناح دونوں وائسریگل لاج میں عشائیہ پر مدعو تھے۔ دوران عشائیہ ان کا تعارف لارڈ چیمسفورڈ سے کروایا گیا۔ رتی نے برطانوی رسم کے مطابق زانو جھکا کے وائسرائے کی تعظیم نہ کی بلکہ ہندوستانی انداز میں ہاتھ اٹھا کے سلام کیا۔ عشائیہ کے بعد وائسرائے نے اپنے اے ڈی سی کے ذریعہ رتی کو بلوایا اور بڑے طمطراق سے ان سے بولے: ''مسز جناح! آپ کے شوہر ایک عظیم سیاسی مستقبل رکھتے ہیں اسے خراب نہ کیجیے۔ آپ نے وہ کہاوت نہیں سنی کہ روم جاؤ تو وہی کرو جو اہل روم کرتے ہیں۔ رتی نے تڑاق سے جواب دیا: ''یور ایکسلینسی، میں نے وہی تو کیا ہے۔ میں ہندوستان میں ہوں اور میں نے وہی کیا جو ہم ہندوستانیوں کا طریقہ ہے''۔ لارڈ چیمسفورڈ سے رتی کی یہ پہلی ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی۔

برجستگی

سن 1921ء میں مسز جناح، نئی دلی میں ایک لنچ کے موقع پر لارڈ ریڈنگ کے ساتھ بیٹھی تھیں، جو وائسرائے تھے۔ ان کے سامنے لارڈ ریڈنگ بار بار اپنا دکھڑا رو رہے تھے: ''ہائے مسز جناح، کیا بتاؤں مجھے جرمنی جانے کی کتنی تمنا ہے! میں وہاں جانے کے لیے کس قدر بے قرار ہوں! لیکن افسوس، جا نہیں سکتا''۔

مسز جناح نے پوچھا: ''یور ایکسلینسی، آخر آپ وہاں کیوں نہیں جا سکتے؟''، لارڈ ریڈنگ بولے: ''بات یہ ہے کہ جرمن، ہم برطانوی لوگوں کو پسند نہیں کرتے ہیں''۔ مسز جناح کہاں چوکنے

والی تھیں، بولیں: ''تو پھر آپ ہندوستان کیسے چلے آئے؟''

لارڈ ریڈنگ تلملا کر رہ گئے اور گفتگو کا رخ بدل دیا۔ تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔

دینا

اسی سفر انگلستان کے دوران محمد علی جناح اور رتی جناح کی زندگی کا ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ یہ وسط اگست کی ایک شام تھی جب جناح، رتی کو تھیٹر دکھانے لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر ان کی اکلوتی بیٹی دینا نے جنم لیا۔ یہ 14 اور 15 اگست کی درمیانی رات تھی۔ عجب اتفاق ہے کہ اس کے ٹھیک 28 سال بعد اسی دن اور اسی وقت جناح کی دوسری تخلیق پاکستان نے جنم لیا۔

رولٹ ایکٹ

1919ء میں جب رولٹ ایکٹ کا بل پیش ہوا تو ہندوستان میں مخالفت کی لہر سی دوڑ گئی۔ لیجسلیٹو کونسل میں سریندر ناتھ بینرجی، سری نواس شاستری، سر تیج بہادر سپرو، محمد علی جناح اور وٹھل بھائی پٹیل نے اس کے خلاف سخت تقریریں کیں۔ جناح نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ جو حکومت اس قسم کے قوانین نافذ کرتی ہے اسے مہذب کہلانے کا حق حاصل نہیں۔

اس ایکٹ کی مخالفت کی تحریک کے سلسلے میں برطانوی حکومت، جن آٹھ ہندوستانیوں کو ملک بدر کرنا چاہتی تھی، ان میں جناح کا نام بھی تھا۔ لیکن بعد میں یہ مصیبت صرف بی جی ہارنی مین کے سر گئی۔ ہارنی مین بیمار تھے اس لیے انگلستان بھیج دیئے گئے اس کے کچھ ہی دن بعد بمبئی کے ایمپائر تھیٹر میں پہلی آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا جلسہ ہوا جس کے صدر لالہ لاجپت رائے تھے۔ اسٹیج پر این۔ این۔ جوشی، بی۔ پی۔ واڈیا، دیوان چمن لال اور سید عبداللہ بریلوی بیٹھے تھے، میں بھی وہاں موجود تھا۔ مسز جناح تھیٹر کے ایک باکس میں سے کارروائی دیکھ رہی تھیں۔ ہارنی مین کے ملک بدر کیے جانے پر احتجاجی قرارداد رتی ہی نے پیش کی۔ اپنی باکس کی نشست سے پانچ منٹ کی نہایت فصیح و بلیغ تقریر میں انہوں نے اپنی بات کہہ دی اور یہی کسی عوامی پلیٹ فارم سے کی جانے والی ان کی واحد تقریر تھی۔

ہوم رول لیگ کا وفد

مسز اینی بیسنٹ 1919ء کے شروع ہی سے اس کوشش میں لگی ہوئی تھیں کہ ہوم رول لیگ کا ایک وفد برطانیہ جا کر پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت دے۔ اس وفد کے لیے مسز بیسنٹ نے جناح، سی۔ پی۔ راماسوامی آئر، بی۔ پی واڈیا اور تیلنگ کے نام تجویز کیے۔ 29 جنوری کو مسز بیسنٹ، گاندھی جی سے ملیں اور انہیں بھی ایک آزاد ممبر کی حیثیت سے وفد شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر یہ نہ ہوسکا۔ گاندھی جی کی حکمت عملی سے بعد کے واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ مسز بیسنٹ کو ہوم رول لیگ کی صدارت ہی سے ہاتھ دھونا پڑا...... مسز بیسنٹ، جس جلسے میں سازشی اور ناگوار حالات میں استعفیٰ دینے پر مجبور ہوئیں، اس میں جناح موجود تھے۔ گاندھی جی مسز بیسنٹ سے ہوم رول لیگ کا پلیٹ فارم چھین لینے پر اڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کا سیاسی فلسفہ یہ تھا کہ "مجھ سے اتفاق کرو ورنہ سیاست میں تمہاری کوئی جگہ نہیں"۔

مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ

1918ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ شائع ہوئی جس میں ہندوستان کی خودمختاری کی طرف قدم بڑھانے کی ایک اسکیم پیش کی گئی۔ ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں اس کی بڑی مخالفت ہوئی۔ البتہ گاندھی جی کا خیال تھا کہ رپورٹ میں ہندوستان کو اتنا ہی کچھ دیا گیا ہے جتنا ہضم کرنا اس کے لیے ممکن ہے۔ مسز بیسنٹ نے رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سفارشات نہ تو اس لائق ہیں کہ برطانیہ انہیں پیش کرتا اور نہ اس قابل ہیں کہ ہندوستان انہیں قبول کرے، پھر بھی وہ انہیں کلی طور پر رد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جناح اس رپورٹ سے بہت مایوس ہوئے لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ سفارشات کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ مسز بیسنٹ سیاسی طاقت رکھتی ہیں، اس لیے انہیں اپنا ہم خیال بنانا چاہیے۔ چنانچہ ان کی دعوت پر مسز بیسنٹ بمبئی آئیں اور دونوں کی دو گھنٹوں تک بات چیت ہوتی رہی۔ جناح چاہتے تھے کہ مسز بیسنٹ سفارشات پر کڑی تنقید کرنے سے اجتناب کریں۔ بات چیت کے بعد تھکے ماندے جناح کمرے سے باہر نکلے تو میں نے ان سے پوچھا "کہو بھئی، کیا ہوا؟" وہ اپنا سر پکڑے ہوئے بولے "ہوا کیا! یاد رکھو، کبھی

عورت سے بحث نہ کرنا''۔

شرربار تقریر

1918ء میں دلی میں ''وار کانفرنس'' منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں لوکمانیہ تلک کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس کے بعد ایسی ہی ایک کانفرنس بمبئی میں بھی منعقد کی گئی جس میں ہوم رول لیگ کو مدعو کیا گیا تھا۔ جناح، لوکمانیہ تلک، کیلکر، ہارنی مین وغیرہ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ جلسہ شروع ہوا تو تلک ایک تجویز پیش کرنے کھڑے ہوئے۔ ابھی ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نکلنے نہ پایا تھا کہ لارڈ ویلنگڈن نے (جو صوبہ بمبئی کے گورنر اور جلسے کے صدر تھے) انہیں ''آؤٹ آف آرڈر'' کہہ کر بولنے سے روک دیا اور بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ پھر کیا تھا، ہوم رول لیگ کے جتنے لیڈر وہاں جمع تھے سب کے سب جلسہ گاہ سے احتجاجاً اٹھ کر چلے گئے لیکن جناح بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے اپنی تقریر میں تلک کی اہانت پر لارڈ ویلنگڈن کے رویے کی سخت مذمت کی۔ جناح کی انتہائی شرربار تقریر حاضرین دم بخود ہو کر سنتے رہے۔ تقریر ختم کر کے جناح بھی جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے۔

سپاسنامہ پر اعتراض

اوائل نومبر میں لارڈ اور لیڈی ویلنگڈن کے بعض وفادار دوستوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گورنری کے عہدے سے سبکدوش ہونے پر، بمبئی کے شہریوں کی جانب سے ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا جائے۔ ہوم رول لیگ کے ارکان اور جناح نے اس کی مخالفت کی۔ ہم سب کا کہنا تھا کہ جن لوگوں کو سپاسنامہ دینا ہو وہ بڑے شوق سے لارڈ ویلنگڈن کے دوستوں اور مداحوں کی حیثیت سے دیں لیکن بمبئی کے شہریوں کے نام پر یہ تقریب منعقد نہ کی جائے۔ یہ مشورہ قبول نہیں کیا گیا اور شیرف آف بمبئی کو بمبئی کے شہریوں کی طرف سے جلسہ طلب کرنے کے لیے خط بھیج دیا گیا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اس تجویز کی مخالفت بڑھتی گئی۔ ان دنوں گاندھی جی تقریباً ہر ہفتہ بمبئی آیا کرتے تھے۔ ایک دن ہم لوگ ان کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ وہ بھی ہماری تحریک کی تائید کریں لیکن جس طرح مسز اینی بیسنٹ کے شہر بدر کیے جانے کے معاملے میں انہوں نے مایوس کیا تھا، اس موقع پر بھی انہوں نے وہی کیا۔ عذر یہ پیش کیا کہ وہ تو احمد آباد کے

شہری ہیں، ہماری تحریک کی تائید کیسے کر سکتے ہیں، ہم نے ان کو ہزار سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ اصولی بات ہے، اس کا تعلق شہریت سے کچھ نہیں ہے، لیکن وہ برابر انکار کرتے رہے۔

ہنگامہ

شیرف آف بمبئی کا طلب کیا ہوا جلسہ ٹاؤن ہال میں 10 دسمبر 1918ء کو ہونے والا تھا اور اسی جلسے میں لارڈ ویلنگڈن کو سپاسنامہ پیش کیا جانے والا تھا۔ ہم تین سو آدمی جناح کی رہنمائی میں ایک دن پہلے رات کے دس بجے ٹاؤن ہال پہنچ گئے تا کہ صبح دروازہ کھلتے ہی سب سے پہلے ہال میں گھس جائیں۔ اگلے دن واقعی ہم سب آٹھ بجے صبح ہال میں داخل ہو گئے اور چھ بجے شام تک وہاں جمے رہے۔ پھر پولیس آئی، ہنگامہ ہوا اور ہم وہاں سے نکال دیئے گئے۔ شام کے پانچ بجے کے قریب مسز جناح بھی ٹاؤن ہال کی سیڑھیاں چڑھتی دکھائی دیں۔ وہ خطرے کے باوجود بڑی جرأت کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ رتی کے والد سر ڈنشا پٹیٹ مخالف پارٹی میں تھے۔ ہنگامے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ درہم برہم ہو گیا اور سپاسنامہ پیش نہ کیا جا سکا۔ یہ جناح کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

جناح ہال

جناح کی شاندار کامیابی سے لوگ اتنے خوش ہوئے کہ عمر سوبانی نے ''جناح میموریل ہال'' کی شکل میں ایک مستقل یادگار قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور لوگوں سے ایک ایک روپیہ چندہ دینے کی اپیل کی۔ ایک ہی مہینے کے اندر 65 ہزار روپے جمع ہو گئے جس سے کانگریس ہاؤس کے احاطے میں ہال بنوایا گیا(1)۔ اس ہال کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کی خاطر مسز بیسنٹ خاص

---

(1): اس عمارت پر ایک تختی لگی ہے، جس پر تحریر ہے:

"THIS HALL HAS BEEN RAISED BY THE CITIZENS OF BOMBAY TO COMMEMORATE THEIR HISTORIC TRIUMPH OF THE 11TH DECEMBER 1918 UNDER THE BRAVE AND BRILLIANT LEADERSHIP OF MOHMED ALI JINNAH".

یہ عمارت اب بھی بمبئی میں جناح پیپلز میموریل ہال کے نام سے موجود ہے۔

طور سے بمبئی آئیں۔(1)

دو ہوم رول لیگ

فروری 1919ء میں مسز بیسنٹ کے ساتھ ساتھ میں بھی ہوم رول لیگ سے مستعفی ہو کر مسز بیسنٹ کی نیشنل ہوم رول لیگ میں اعزازی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس وقت ملک میں دو جماعتیں ہوم رول لیگ کے نام سے کام کر رہی تھیں، ایک نیشنل ہوم رول لیگ اور دوسری آل انڈیا ہوم رول لیگ، جناح، آل انڈیا ہوم رول لیگ کی شاخ کے صدر تھے۔ فروری 1920ء میں انہوں نے مجھے آل انڈیا ہوم رول لیگ میں شریک ہونے کو کہا لیکن میں نے مشورہ دیا کہ دونوں لیگیں مل جل کر کام کریں تو بہتر ہوگا۔ میں اور عمر سوبانی اس اتحاد عمل کے لیے بڑے بے چین تھے۔ چنانچہ ہم تینوں نے اپنی تجویز مسز بیسنٹ کو بھیج دی۔ وہ بمبئی آئیں اور اس مسئلے پر انہوں نے ڈھائی گھنٹے بات چیت کی۔ اس کے بعد مجھے آل انڈیا ہوم رول لیگ کی کونسل میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔

گاندھی جی لیگ کے صدر

جناح چاہتے تھے کہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات پر مؤثر طریقے سے عمل کرنے کی خاطر ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر وہ گاندھی جی کو ہوم رول لیگ میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اصلاحات پر عمل کرنے میں گاندھی جی پر قابو پایا جا سکے گا۔ چنانچہ جنکر کی مخالفت کے باوجود جناح نے گاندھی جی کا نام آل انڈیا ہوم رول لیگ کی صدارت کے لیے پیش کر دیا۔ اس پیشکش پر گاندھی جی نے 18 مارچ 1920ء کو جو خط سری نواس شاستری کو لکھا تھا وہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے:

---

(1) رضوان احمد نے اپنی کتاب ممبر سے قائداعظم میں لکھا ہے کہ اس ہال کی رسم افتتاح مسز سروجنی نائیڈو نے انجام دی تھی۔ ان کے مطابق سروجنی نائیڈو نے قائداعظم کو ایک تار کے ذریعے اس رسم افتتاح کی اطلاع دی جس میں تحریر تھا: "امن و اتحاد کے پیامبر کی قدر و منزلت اس کی زندگی میں اور اس کے اپنے ملک میں کی گئی۔ مبارک صد مبارک"۔ یہ عبارت درحقیقت انگریزی زبان کے ایک محاورے کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ انگریزی زبان کا محاورہ یہ ہے کہ "ایک پیامبر کی قدر و منزلت اپنے ملک میں نہیں کی جاتی"۔ (ع ع ج)

''چونکہ گزشتہ سال میں نے کانگریس کے معاملات میں کسی حد تک حصہ لیا تھا اس لیے اب مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ اور زیادہ عملی کام کرنے کی خاطر میرے لیے بہتر ہوگا کہ میں کسی جماعت میں شریک ہو جاؤں۔ یہ مطالبہ ایسے لوگوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے جن کے ساتھ کام کرنے کی عزت مجھی اس وقت سے حاصل ہے جب میں ان کی جماعت میں شریک تک نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے آل انڈیا ہوم رول لیگ میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا ہے کہ اپنی زندگی میں ایک منزل پر پہنچ کر جہاں بہت سے معاملات میں میرے خیالات میں پختگی آ چکی ہے، کسی جماعت میں صرف اسی حالت میں شامل ہو سکتا ہوں جبکہ میرے لیے اس کی پالیسی کو متاثر کرنا ممکن ہو نہ کہ اس کی پالیسی سے میرا متاثر ہونا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنے دماغ میں نئے خیالات اور نئی روشنی کو آنے ہی نہ دوں گا۔ البتہ اس پر ضرور اصرار کروں گا کہ یہ نئی روشنی واقعی تیز اور چمکدار بھی ہو۔ میں نے اپنے دوستوں کے سامنے یہ پانچ نکات پیش کیے ہیں:

1۔ اگر ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے اپنا مقام پیدا کرنا ہے تو ملک کی سیاسی زندگی میں انتہائی ایمانداری کو داخل کرنا چاہیے۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ حق وصداقت پر اس درجہ ایمان ہو کہ کسی قیمت اور مصلحت پر اسے قربان نہ ہونے دیا جائے۔

2۔ ''سودیشی'' ہماری پہلی منزل ہونی چاہیے۔ کونسل کی رکنیت چاہنے والے پہلے اس کا عہد کریں کہ وہ ملکی صنعتوں کو بالخصوص کپڑے کی صنعت کو، ہر حال میں بچانے کی کوشش کریں گے۔

3۔ ہندی اور اردو کے امتزاج سے بنی ہوئی زبان ''ہندوستانی'' کو

قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لینا چاہیے۔ امپیریل کونسل کی رکنیت کے امیدواروں کو عہد کرنا ہوگا کہ وہ قومی معاملات میں امپیریل کونسل کے ایوان میں انگریزی کے بجائے ہندوستانی کو اور لوکل کونسل میں علاقائی زبان کو رواج دینے کی کوشش کریں گے۔ انہیں اس کا بھی عہد کرنا ہوگا کہ اسکولوں میں ہندوستانی کی تعلیم کو ایک لازمی مضمون کی طرح، اور دیوناگری یا اردو رسم خط کو اختیاری حیثیت سے رائج کریں گے۔ انگریزی زبان صرف سفارتی یا سرکاری کاموں کے لیے استعمال کی جائے گی۔

4- جتنا جلد ممکن ہو سکے لسانی بنیادوں پر ہندوستان کی تنظیم کی جائے۔

5- میں سیاسی اور مذہبی نقطہ نظر سے ہندو مسلم اتحاد کو اپنے غیر متزلزل عقیدے کا جزو مانتا ہوں۔ اس پر عمل کرنے میں باہمی تعاون، رواداری اور کسی ایک طبقے کی تکلیف کو سب کی تکلیف سمجھنے کا احساس پیدا کرنا ہوگا۔ لیکن ان مقاصد کے لیے لیگ کے لائحہ عمل میں ایک ساتھ کھانا پینا اور ذات سے باہر شادی بیاہ رچانا شامل نہیں ہے۔ البتہ مسئلہ خلافت پر انتہائی تعاون کو جگہ دی جائے گی۔ ان باتوں پر اپنے احباب سے گفتگو کے دوران میں یہ بات میں نے واضح کر دی ہے کہ میں اپنے عدم تشدد کے عقیدے کو سرکاری طور سے منوانے کی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ چونکہ میں کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتا اس لیے چاہوں گا کہ لیگ بھی پارٹی سے الگ ایک ایسی جماعت ہو جو پارٹی کے امتیاز کے بغیر ان لوگوں کی حمایت کرے جو ایمان دار ہوں اور خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لیگ، کانگریس کی مخالف جماعت نہیں بن سکتی۔ اس کو تو کانگریس کے مقاصد کو حاصل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہونا چاہیے۔

میری صلاحیتوں اور میری کوتاہیوں سے آپ جس طرح اور جس قدر بھی واقف ہیں اس کے پیش نظر بتایئے کہ مجھے لیگ میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں؟''

سری نواس شاستری نے اس خط کا کیا جواب دیا، یہ تو معلوم نہ ہو سکا لیکن گاندھی جی ہوم رول لیگ کے صدر بن گئے اور اسی وقت سے گویا انہوں نے آگ سے کھیلنا بھی شروع کر دیا۔ 10 مارچ کو انہوں نے اعلان کیا کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو وہ عدم تعاون کی تحریک شروع کر دیں گے۔ یہی وہ ہتھیار تھا جس سے وہ تشدد کے بغیر لڑ سکتے تھے۔

یکم اگست 1920ء کو تلک کا انتقال ہو گیا۔ اس کے چھ ہفتے بعد کلکتے میں کانگریس کا خصوصی اجلاس ہوا، لالہ لاجپت رائے صدر تھے۔ جب گاندھی جی نے عدم تعاون (نان کوآپریشن) کی تجویز پیش کی تو مسز بیسنٹ، جناح، سی۔آر۔داس اور مہاراشٹر سے تلک کے ساتھیوں نے تجویز کی مخالفت کی۔ جناح، ان کی بیوی، جیکر، عمر سوبانی، جمنا داس اور شنکر لال ''کانگریس اسپیشل'' ٹرین سے کلکتہ گئے تھے۔ ہاوڑہ اسٹیشن پر موتی لال نہرو جناح سے ملے۔ اس وقت میں بھی موجود تھا۔ موتی لال نہرو نے جناح کو بتایا کہ گاندھی جی عدم تعاون کی تجویز پیش کرنے والے ہیں جس کے معنی یہ ہوں گے کہ کونسل، اسمبلی وغیرہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ موتی لال نے جناح کو مشورہ دیا کہ وہ مسز بیسنٹ، سی۔آر۔داس، لالہ لاجپت رائے اور مالویہ کے ساتھ مل کر اس تجویز کو نامنظور کرائیں۔ لیکن اس کے دس بارہ دن بعد جب تجویز پر ووٹ لینے کا وقت آیا تو اپنے بیٹے، جواہر لال نہرو کے اثر میں آ کر خود موتی لال نے گاندھی جی کے ساتھ اس تجویز کی موافقت میں ووٹ دیا۔ ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی تو ایسا گمان ہونے لگا کہ تجویز نامنظور ہو جائے گی۔ چنانچہ نہایت ہوشیاری سے رائے شماری کا کام اگلے دن پر اٹھا رکھا گیا۔ دوسرے دن عمر سوبانی اور شنکر لال ادھر ادھر سے کوئی سو آدمی جلسے میں پکڑ لائے اور ان سب نے گاندھی جی کی تجویز کے حق میں ووٹ دے دیا۔ تجویز معمولی اکثریت سے منظور ہو گئی۔ یہ ساری داستان اب تک ڈاکٹر امبید کر کے سوا اور کسی نے بیان نہیں کی ہے۔

سودے بازی

ہم لوگوں کو کلکتہ سے بمبئی لوٹے پندرہ روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ گاندھی جی نے جناح پر گویا بم کا گولہ مارا۔ بات یہ ہوئی کہ گاندھی جی نے علی برادران سے مل کر تحریک خلافت کی جو حمایت کی تھی وہ جناح کو بالکل ناپسند تھی اور یہ بات گاندھی جی کو سخت ناگوار گزری۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاندھی جی نے مسلم لیڈروں سے جن میں علما اور مذہبی پیشوا بھی تھے، ایک سمجھوتا کیا جس کی شرط یہ تھی کہ اگر مسلمان رہنما انڈین ہوم رول لیگ میں اپنے تعاون کا اعلان کر دیں اور گائے کا ذبیحہ بند کر دینے کا وعدہ کر لیں تو گاندھی جی ہندوؤں کو خلافت تحریک کی حمایت پر آمادہ کر لیں گے۔ اس وقت جناح اور عمر سوبانی دونوں نے گاندھی جی کو اس سودے بازی سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے گاندھی جی کو متنبہ کیا کہ ملکی سیاست میں مذہبی رعایت مناسب نہیں ہے مگر ان دنوں علی برادران اور گاندھی جی، دونوں کا نعرہ تھا: ''جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا مخالف ہے۔ جو گاندھی جی کے ساتھ نہیں وہ غدار اور ٹوڈی ہے، برطانوی ایجنٹ ہے، ملک کے مفاد کے خلاف ہے''۔ اس قسم کی نعرہ بازی اور پروپیگنڈے کے جو لوگ شکار ہوئے ان میں جناح کی شخصیت سب سے نمایاں اور اہم تھی۔

علیحدگی

بمبئی ہوم رول لیگ کے صدر کی حیثیت سے جناح کی طاقت بے پناہ تھی۔ 20 اپریل 1920ء کو عدم تعاون کی تجویز کے منظور کیے جانے کے بعد عمر سوبانی اور شنکر لال اس کے سیکریٹری کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ میں اور کنہیا لال منشی مقرر کیے گئے۔ ستمبر 1920ء کے ناگ پور اجلاس کے دوران گاندھی جی نے جناح کی سیاسی طاقت کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کے بعد جو واقعات ملک میں رونما ہوئے ان کا اثر آزادی کے 18 سال بعد بھی برابر محسوس ہوتا رہا ہے۔

گاندھی جی کے مشورے سے ان کے ساتھیوں نے ہوم رول لیگ کے نام اور دستور میں ترمیم اور تنسیخ کرنے کے لیے، لیگ کا ایک جلسہ طلب کیا۔ تجویز یہ تھی کہ ڈومینین اسٹیٹس

(Dominion Status) کے بجائے مکمل آزادی ''پورن سوراج'' کو نصب العین بنایا جائے۔ آئینی احتجاج کے بجائے پرامن احتجاج کا طریقہ اپنایا جائے جس میں عدم تعاون اور عام قانون شکنی بھی شامل ہو۔ یہ بھی کہا گیا کہ ہوم رول لیگ کا نام بدل کر ''سوراج سبھا'' کر دیا جائے۔ جناح اور ان کے ساتھی ان بنیادی تبدیلیوں کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ چنانچہ جناح، جیکر، منشی، میں اور ہمارے پندرہ ساتھیوں نے ہوم رول لیگ یعنی سوراج سبھا سے استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح ہوم رول لیگ پر غاصبانہ قبضہ کر کے گاندھی جی نے جناح اور ان کے ساتھیوں کو الگ کر دیا اور اس کے بعد ''سوراج سبھا'' بھی ختم کر دی گئی۔

گاندھی جی کی کامیابی

دسمبر میں کانگریس کا اجلاس ناگ پور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کا میدان گاندھی جی کے ہاتھ رہا۔ اس موقع پر کانگریس نے برطانیہ سے اپنا ناتا توڑا اور آئینی احتجاج کے طریقہ کار کو خیرباد کہہ دیا۔ عدم تعاون کی تجویز منظور ہوتے ہی کانگریس کی ہیئت بدل گئی۔ پنڈت مالویہ، جناح اور کھاپرڈے نے گاندھی جی کے نظریے کی سخت مخالفت میں زبان کھولی لیکن لوگوں نے اتنا ہنگامہ مچایا کہ وہ تقریر بھی نہ کر سکے۔ جناح نے ملک کو عدم تعاون کے منفی رویے سے باز رکھنے کی ایک اور کوشش کی۔ انہوں نے گاندھی جی کے خیالات کی مخالفت کرتے ہوئے ایک نہایت بے باک تقریر کی۔ لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کو لسانی ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز بھی منظور کی گئی۔ اس تجویز کی مصلحت اور انگریزی زبان کو ترک کر دینے کا فائدہ، ابھی تک نہ ہندوستان سمجھ سکا نہ دنیا۔ ناگ پور اجلاس میں گاندھی جی نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ ایک برس میں یعنی 3 دسمبر 1921ء تک ہندوستان کو سوراج دلا دیں گے۔

گول میز کانفرنس

دسمبر 1921ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ تھے۔ انہوں نے جمنا داس اور ہردے ناتھ کنزرو کے ذریعے ایک گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ اس کانفرنس میں برطانوی حکومت کی نمائندگی وہ خود کرنے والے تھے۔ جن ہندوستانی لیڈروں کو شرکت کی دعوت دی جانے

والی تھی ان میں گاندھی جی اور ان کے رفقا کے نام بھی تھے۔ گاندھی جی نے اس میں شریک ہونا منظور کر لیا اس کے بعد جب میں ایک روز ان سے ملنے گیا تو وہ ولبھ بھائی پٹیل اور بعض مسلمان علما سے گفتگو کرنے میں مصروف تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ جب تک حکومت علی برادران کو قید سے رہا نہ کردے اس وقت تک گاندھی جی کو گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ اس گفتگو کے تقریباً ایک گھنٹے بعد سرتیج بہادر سپرو کو تار بھجوا دیا گیا کہ گاندھی جی نے لارڈ ریڈنگ کی دعوت رد کر دی ہے۔

جناح کی پریشانی

2 جنوری 1922ء کی شام کو میں جناح سے ملا۔ رتی ان کے پاس تھیں۔ ہم لوگ چار بجے صبح تک یعنی مسلسل سات گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ جناح یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ گاندھی جی کے انکار کا ردعمل مسز بیسنٹ اور سرتیج بہادر سپرو پر کیا ہوا، انہوں نے بتایا کہ وہ (جناح) ایک کانفرنس بمبئی میں بلائے جانے والے ہیں جس میں امبالال سارابھائی، پنڈت مدن موہن مالویہ، جیکر، پرشوتم داس، ٹھاکرداس، نٹراجن اور بھرگری کے علاوہ گاندھی جی کو شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ اس کانفرنس کے ذریعے وہ لارڈ ریڈنگ کو گول میز کانفرنس کی دعوت کی تجدید پر رضامند کرنا چاہتے تھے تاکہ گاندھی جی کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کا موقع ملے۔ جناح نے مجھے امبالال کے مکان پر بلایا۔ وہاں کانفرنس کے انتظامات کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ جناح چاہتے تھے کہ میں اس کام میں ان کی مدد کروں۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ مسز بیسنٹ کو شرکت کی دعوت دوں۔ چنانچہ ہم نے انہیں تار کے ذریعے صورت حال کی اطلاع دی۔ مسز بیسنٹ کا جواب آیا کہ ان کا بمبئی جانا بے سود ہوگا۔ کیونکہ گاندھی جی تعاون کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے۔ یہ کانفرنس تو ہوئی لیکن گاندھی جی نے اس میں واقعی بڑا منفی رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے معاملات کو سلجھانے میں مدد ملنے کے بجائے اچھی خاصی رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ جلسے کے صدر، سرشنکرن نائر، تنگ آ کر جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے۔ کانفرنس قطعی ناکام رہی، اس کے ذمہ دار بڑی حد تک گاندھی جی تھے۔ وائسرائے نے دیکھا کہ جس نفسیاتی مقصد کی خاطر وہ گول میز کانفرنس کی پیش کش کر رہے تھے وہ

باقی نہیں رہا۔ کلکتے میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ ہو چکا تھا حالانکہ لارڈ ریڈنگ اسی کو روکنا چاہتے تھے۔ اس واقعے کا انہیں بڑا صدمہ تھا۔ انہوں نے گول میز کانفرنس کی دعوت کی تجدید فضول سمجھی۔ جناح بھی بے حد مغموم تھے۔ انہیں حکومت اور گاندھی جی دونوں نے صدمہ پہنچایا تھا۔ جناح نے بڑے عزم کے ساتھ ایک نئی پارٹی بنانے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں جیکر اور نٹراجن ان کی مدد پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس کے بعد جناح سیاسی میدان سے ہٹ گئے اور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔

نئی پارٹی

کانگریس نے 1921ء میں عدم تعاون (نان کوآپریشن) تحریک شروع کی جو 12 فروری 1912ء کو باردولی کی تجویز کی رو سے ملتوی کردی گئی۔ اس کے بعد حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک اور کمیٹی مقرر کی گئی۔ خاص مسئلہ یہ تھا کہ کونسل میں شرکت کی جائے یا نہیں؟ لیکن کافی بحث مباحثے کے بعد بھی کمیٹی اس سوال پر متفق نہ ہو سکی۔ حکیم اجمل خاں، وٹھل بھائی پٹیل اور موتی لال نہرو، کونسل میں جانے کے حق میں تھے اور ڈاکٹر انصاری، سری نواس آئنگر اور راج گوپال آچاریہ اس کے مخالف تھے۔ دسمبر 1923ء میں گیا میں کانگریس کا اجلاس، سی۔ آر۔ داس کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں کونسل جانے کے خلاف فیصلہ ہوا تو سی۔ آر۔ داس، کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ انہوں نے موتی لال نہرو کے ساتھ ''سوراج پارٹی'' بنائی۔ اس پارٹی نے کانگریس ہی کا سارا پروگرام، یہاں تک کہ عدم تعاون کا اصول تک اپنا لیا، صرف کونسل جانے کی حمایت کی حد تک اس کی پالیسی کانگریس سے مختلف تھی۔ جب انتخابات ہوئے تو مرکزی اسمبلی کی ایک سو نشستوں میں سے 43 نشستیں سوراج پارٹی نے حاصل کیں۔ یہ خاصی کامیابی کی دلیل تھی۔ پارٹی کے لیڈر موتی لال نہرو منتخب ہوئے۔

جناح اور موتی لال نہرو

نئی مرکزی اسمبلی میں موتی لال نہرو، اپنے 40 رفقا کے ساتھ جناح اور مالویہ جی کے گہرے تعاون سے کام کرنے لگے۔ اس طرح حزب مخالف میں تیس ارکان کا اور اضافہ ہو گیا، یہ سب مل

"نیشنلسٹ پارٹی" کہلاتے تھے۔ ان دنوں اسمبلی میں سر پرشوتم داس ٹھاکر داس، جی۔ ڈی۔ برلا، پنڈت مدن موہن مالویہ، سری نواس آئنگر، لالہ لاجپت رائے، وکرز ساسون اور وٹھل بھائی پٹیل جیسے حضرات کے لیڈر موتی لال نہرو تھے۔ اسمبلی کا سب سے شاندار اور نمایاں پہلو جناح اور موتی لال نہرو کی سیاست اور ان کا شانہ بشانہ کام کرنا تھا۔

ستمبر 1924ء کے اجلاس کے دوران مرکزی اسمبلی کی 28 آزاد ارکان نے ایک مستقل پارٹی بنائی جس کے لیڈر جناح منتخب ہوئے۔ اس طرح سوراج پارٹی اور آزاد ارکان سے مل کر نیشنلسٹ پارٹی قائم ہوگئی۔

اسمبلی میں سرگرمیاں

مئی 1924ء میں برطانوی لیبر حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جس کا مقصد یہ جاننا تھا کہ 1919ء کے ایکٹ میں وہ کون سی ترمیمیں ہونی چاہئیں جن کی وجہ سے ہندوستانی حکومت موثر ہو سکے۔ اس کمیٹی کے چیئرمین سر الیگزینڈر مڈی مین تھے اور اس کے ارکان میں سر محمد شفیع، جناح، تیج بہادر سپرو اور پرانجپے تھے۔ کمیٹی نے اکتوبر 1924ء میں شہادتیں لیں، لیکن ابھی ان شہادتوں پر غور کرنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ برطانیہ کی لیبر حکومت کا تختہ الٹ گیا، اور اس کی جگہ کنزرویٹو پارٹی نے لے لی۔ یہاں ایک دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ شہادتیں لینے کے بعد بھی برطانوی حکومت کی تبدیلی کے پیش نظر، رپورٹ کے مسودے پر غور کرتے وقت بعض مخصوص پسندوں سے خاموشی کے ساتھ دوبارہ شہادتیں لی گئیں، اور اس بار انہوں نے جو کچھ کہا وہ ان کے پہلے دیے ہوئے بیان سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے بعد دو رپورٹیں تیار کی گئیں۔ ایک پر ارکان کی اکثریت نے اور دوسری پر اقلیت نے دستخط کیے تھے۔ اقلیتی رپورٹ پر سپرو، شیوا سوامی، جناح اور پرانجپے نے دستخط کیے تھے۔ سر محمد شفیع نے پہلے تو اکثریت کی رپورٹ پر دستخط کیے۔ وہ اس وقت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے، لیکن جیسے ہی وہ اس عہدے سے سبکدوش ہوئے انہوں نے اقلیت کی رپورٹ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

سوراج پارٹی کا تعاون

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سوراج پارٹی کی اسمبلی میں شرکت کا مقصد 1919ء ایکٹ کو ختم کرنا اور حکومت سے عدم تعاون تھا لیکن ایسے منفی پروگرام پر عمل کرنا موتی لال نہرو کے تدبر اور فراست کے خلاف ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے ٹھوس تجاویز پیش کیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ حکومت ایک گول میز کانفرنس بلائے جس میں حکومت کے دستور پر بحث ہو۔ اس کی خاطر انہوں نے اپنے تعاون کا وعدہ بھی کیا لیکن افسوس حکومت نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا ورنہ آج ہندوستان کی تاریخ شاید کچھ اور ہی ہوتی۔

ووٹ کی قیمت

مئی 1924ء میں اسمبلی کا اجلاس شملہ میں ہوا۔ اس موقع پر لوہے اور فولاد کی صنعت کو مضبوط بنانے کی تجویز پیش ہوئی۔ اس کی رو سے جمشید پور میں ٹاٹا کے کارخانے کو خاصی امداد ملنے والی تھی۔ اسمبلی کے بعض ارکان بل کے مخالف تھے۔ مگر ایک طرف موتی لال نہرو اور جناح کا باہمی تعاون تھا اور دوسری طرف ان دونوں کا حکومت سے بھی تعاون تھا۔ چنانچہ بل مخالفت کے باوجود منظور ہوگیا۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ جس کا انکشاف تین سال بعد ہوا۔ جناح کے بنگلے پر ایک رات ڈنر تھا۔ موتی لال نہرو، ڈی۔ آر۔ ٹاٹا اور میں، شریک تھے۔ وہاں اس بل کا تذکرہ چھڑا۔ جناح ان دنوں کی اسمبلی کی چٹ پٹی باتیں سنانے لگے، جن پر خوب قہقہے لگے۔ جناح نے کہا جس روز بل پر ووٹ لیے جانے والے تھے اس سے ایک دن پہلے رات کے وقت رتن ٹاٹا بے تحاشا بھاگے ہوئے سیسل ہوٹل میں ان کے (جناح کے) کمرے میں پہنچے اور بڑی گھبراہٹ میں چلا کر کہنے لگے "جناح، کچھ سنا تم نے؟ غضب ہوگیا، اسمبلی کے رکن...... صاحب کہتے ہیں کہ اگر میں نے ایک بڑی بھاری رقم انہیں نہ دی تو وہ اس بل کے خلاف ووٹ دیں گے"۔ یہ رکن موتی لال کی پارٹی کے آدمی تھے۔ رات زیادہ ہوچکی تھی پھر بھی جناح نے ان صاحب کو جنہوں نے رقم کا مطالبہ کیا تھا اور اسی ہوٹل میں مقیم تھے، بلوا بھیجا، جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے، جناح نے ڈانٹ کر کہا "رتن ٹاٹا مجھ سے شکایت کررہے ہیں کہ آپ نے ان سے

اپنے ووٹ کی قیمت دس ہزار روپے طلب کی ہے۔ اطمینان رکھیے، یہ رقم آپ کو ہرگز نہیں ملے گی۔ آپ جہنم میں جائیں اور سردست اس کمرے سے باہر تشریف لے جائیں''۔ یہ صاحب منہ لٹکائے وہاں سے چلے آئے اور مزے کی بات یہ کہ اگلے دن انہوں نے بل کے حق میں ووٹ دیا۔ رتی اور موتی لال کے ساتھ میں بھی اس دلچسپ واقعے سے خوب لطف اندوز ہوا۔ رتن ٹاٹا نے، جو وہاں موجود تھے، اس کی تصدیق کی، موتی لال نہرو کو اس واقعے کا پہلے سے علم تھا۔

یہ جناح اور موتی لال کے اسی باہمی تعاون کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعتیں مستحکم بنیادوں پر قائم ہیں۔ موتی لال نہرو کے دل میں جناح کی بے حد عزت تھی اور وہ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ بالکل یہی معاملہ جناح کا موتی لال نہرو کے ساتھ تھا۔

1924ء سے 1929ء تک

جنوری 1921ء کی گول میز کانفرنس کی ناکام کوشش کے بعد جناح مایوس ہو کر سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنی پریکٹس کی طرف توجہ کرنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ کانگریس اور حکومت، دونوں نے غیر مناسب رویہ اختیار کر لیا ہے تو پھر ان کے لیے سیاسی مسائل میں الجھنا، تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جناح نے وقت کا انتظار کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ جب عدم تعاون اور خلافت، دونوں تحریکیں ناکام ہوئیں تو وہ نومبر 1923ء میں مرکزی اسمبلی میں داخل ہوئے۔ وہاں 28 آزاد ارکان کے گروپ لیڈر کی حیثیت سے انہوں نے موتی لال نہرو کے 42 ارکان پر مشتمل، سوراج پارٹی سے تعاون کیا۔ جناح بلاشبہ ایک عظیم قوم پرست تھے جن کی قیادت کا اعتراف صرف مسلمانوں کے ترقی پسند طبقے ہی کو نہیں، بلکہ اسے ہندوؤں کی بڑی تعداد بھی تسلیم کرتی تھی۔

عدم تعاون اور تحریک خلافت کے زمانے میں یعنی 1921ء سے 1924ء تک مسلم لیگ ساکت اور بے جان سی رہی لیکن جیسے ہی یہ تحریکیں ڈھیلی پڑیں، مسلم لیگ میں زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ 1924ء میں مسلم لیگ کا پندرھواں سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر جناح نے لوگوں کو بتایا کہ اگرچہ عدم تعاون کی تحریک ناکام رہی، اس سے کافی نقصان پہنچا

لیکن کچھ فائدے بھی ہوئے۔عوام بیدار ہو گئے ہیں اور اب وہ آزادی کا مطالبہ کرر ہے ہیں۔ فوری طور پر ان کی مانگ ''ذمہ دار ڈومنین'' حکومت کی ہے۔اس مطالبہ کے حصول کی خاطر ان میں ایک طرح کی بے خوفی آ چکی ہے۔ہندوستان کے عام آدمی میں سیاسی شعور پیدا ہو چلا ہے چنانچہ اب وہ سمجھنے لگا ہے کہ اس کی خودداری اور عزت کا تقاضا یہ ہے کہ اس ملک کی باگ ڈور غیروں کے بجائے خود ملک کے لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔جناح نے یہ بھی بتایا کہ لیگ اعلان کر چکی ہے کہ اس کا مقصد ملک کے لیے آزادی حاصل کرنا ہے۔اب تک ملک میں غیر ملکی حکومت اس لیے جمی ہوئی تھی کہ ہندو اور مسلمان آپس میں متحد نہیں تھے۔جس دن ان میں اتحاد ہو جائے گا اسی روز ہندوستان کو ذمہ دار ڈومنین حکومت مل جائے گی۔ہندوستان کے دستور کے لیے جناح نے دو بنیادی اصول پیش کیے جن کی بدولت، دستور (ان کے خیال میں) مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہو سکے گا۔

الف) دستور وفاقی (فیڈرل) طرز کا ہو جس کی رو سے صوبوں کو خود مختاری حاصل ہے۔ مرکزی حکومت کا تعلق صرف عام مسائل تک باقی رہے۔

ب) ہر صوبے میں اقلیتوں کو معقول اور مؤثر نمائندگی دی جائے اور جو سر دست جداگانہ انتخابات کے ذریعے ہو۔

جناح نے 1919ء کے مانٹیگو ایکٹ پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ایکٹ ناکافی اور قطعی تسلی بخش نہیں ہے، اس لیے پوری کوشش کی جانی چاہیے کہ ملک میں مکمل ذمہ دار حکومت قائم ہو۔اس کے بعد 13 جولائی 1925ء کو جناح نے جیکر کو یہ خط لکھا:

> ''میری رائے میں ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ الزام سوراج پارٹی کے سر تھوپا جا سکے۔اگر حکومت کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ چونکہ سوراج پارٹی تعاون نہیں کر رہی ہے اس لیے وہ بھی کچھ نہیں کر سکتی ہے، تو یہ بڑے افسوس کی بات ہوگی۔آپ کو چاہیے کہ صاف صاف کہہ دیں کہ سوراج پارٹی تعاون کرنے پر آمادہ ہے اور چاہے موجودہ آئین میں کچھ خرابیاں

ہی کیوں نہ ہوں وہ اس کے تحت ذمہ داری بھی سنبھالنے کے لیے تیار ہے۔ شرط اتنی ہے کہ حکومت فوراً اس کا اعلان کردے کہ آئین پر نظر ثانی کرنے اور ترمیم کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے گا جس کے ارکان ایسے ہوں گے جو ہمارے ملک کے لیے قابل قبول ہوں گے اور ان کی قوم کا اعتماد حاصل ہوگا۔ جب اس وقت کے وزیر ہند برکن ہیڈ نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ گورنمنٹ، سیکریٹری آف اسٹیٹ اور مقرر کردہ رائل کمیشن ان تمام تجویزوں اور اسکیموں پر غور کرے گا جنہیں لوگوں کی حمایت حاصل ہوگی، تو اس وقت میرے خیال میں، انہیں یہ توقع ہوگی کہ ہم لوگ کسی ایک اسکیم پر رضامند ہی نہ ہوں گے۔ اس لیے اس معاملے پر زیادہ زور نہیں دیا جائے گا۔ لیکن ہم کو حکومت سے اس مطالبات پر اصرار کرنا ہے:

(الف) اس بات کا صاف اعلان کہ آئین میں ترمیم کی جائے گی۔

(ب) شاہی کمیشن فوراً مقرر کیا جائے۔

(ج) کمیشن کے ارکان قابل اعتماد ہوں گے۔

اس کے ساتھ ہی اپنی طرف سے ہم اعلان کردیں کہ اس دوران ہم موجودہ آئین کے تحت کام کرنے کے لیے تیار ہیں گو کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ناقص ہے اور اس سے خاطر خواہ فائدے حاصل نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ جب ایسا سمجھوتا ہو چکے تو پھر سوراج پارٹی وزارت بنائے۔ بنگال اور سی۔ پی کے سیاسی قیدی رہا کردیے جائیں۔ اس طرح آئین پر نظر ثانی کرنے کے لیے، تعاون اور باہمی مصالحت کی فضا تیار ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا گیا تو میرے خیال میں وہ اتنی ہی بڑی غلطی ہوگی جیسے کہ 22-1921ء میں گاندھی جی نے گول میز کانفرنس کی تجویز

کوردکر کے کی تھی۔ مجھے امید ہے کہ سوراج پارٹی اپنے آپ کو دوسری پارٹیوں کی طرح نکما بنا کر نہیں رکھے گی''۔

جناح کی وصیت

1926ء میں کلکتہ سے ایک کتاب چھپی تھی جس میں ہندوستان کی مشہور کمپنیوں کے نام اور ان کے بڑے بڑے حصہ داروں کے نام تھے۔ جناح کا نام تین کمپنیوں کے تحت درج تھا: ٹاٹا اسٹیل، بمبئی ڈائنگ اور ٹراموے کمپنی۔ ان تینوں میں ان کے چودہ لاکھ روپے کے حصے تھے۔ یہ سرمایہ اس وقت کی قیمتوں کے لحاظ سے ہے، ظاہر ہے کہ پچھلے برسوں میں یہ سرمایہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوگا۔ جناح سٹے یا قسمت آزمائی کے بیوپار یا مشغلے کے بالکل قائل نہ تھے۔ وہ اپنا سرمایہ بڑی احتیاط کے ساتھ اور کافی سوچ بچار کے بعد کہیں لگاتے تھے۔ ان کی وفات کے وقت ان کے ذاتی اثاثے کی قیمت کروڑوں تک پہنچ گئی ہوگی۔ وفات کے بعد جب جناح کی وصیت پڑھی گئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے چھ لاکھ روپے علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے چھوڑے ہیں، جس کے بارے میں ان کے سوانح نگار ہیکٹر بولیتھو نے بتایا کہ آج تک اس رقم کا مطالبہ نہ تو علی گڑھ یونیورسٹی نے کیا اور نہ حکومت ہند نے۔ واضح رہے کہ جناح کی وصیت قیام پاکستان سے پہلے لکھی گئی تھی۔ کیا اس وصیت نامے سے یہ بات ثابت نہیں ہوگی کہ جناح کو ہندوستان کے بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہونے کی ہرگز توقع نہ تھی؟

افواج کی ہندوستانیت

فروری 1925ء میں حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد افواج میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی عناصر داخل کرنے اور سینڈھرسٹ اکیڈمی کے نمونے پر فوجی کالج قائم کرنے کی سفارشات پیش کرنی تھیں۔ جناح اور موتی لال نہرو مستعفی ہوگئے۔ جناح نے کمیٹی کی طرف سے شہادتیں جمع کرنے میں قانونی جرح کے وہ سارے گر استعمال کیے جن کے وہ ماہر تھے۔ ان کی جرح جن انگریز فوجی افسروں کو بہت ناگوار گزاری، ان میں ڈگلس گریسی بھی تھے، لیکن اس کے باوجود اس کام میں کہیں بھی کسی قسم کی تلخی پیدا نہ ہونے پائی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ 1947ء میں

پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے جناح نے مسٹر ڈگلس گریسی ہی کو پاکستانی افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا۔

1926ء میں جناح اسکین (سینڈھرسٹ) کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے یورپ اور امریکا بھی گئے تھے۔ رتی ان کے ساتھ تھیں۔ دہرہ دون کا فوجی کالج اس کمیٹی کی سفارشات کا نتیجہ ہے۔

اصلاحی کارروائیاں

ملک کے مختلف مسائل کے بارے میں جناح کا رویہ ہمیشہ ترقی پسندانہ اور اصلاحی رہا ہے۔ لیبر اور سماجی اصلاح (سوشل ریفارم) پر اسمبلی جتنے بل پیش ہوئے ان سب کی جناح تائید کرتے رہے۔ انہوں نے ایام زچگی میں اجرت دیئے جانے کی حمایت کی اور شادی کی رضامندی کی عمر بڑھانے کی تجویز کی تائید کی۔ واقعہ یہ ہے کہ جناح نہ تو سیاست میں رجعت پسند رہے اور نہ معاشرتی اصلاح کے معاملے میں کبھی کسی سے پیچھے رہے۔

بے نظیر انتخاب

1926ء میں مرکزی اسمبلی کی مسلم نشست کے لیے جناح بمبئی سے کھڑے ہوئے۔ انہیں اپنی کامیابی کا اس قدر یقین تھا کہ انہوں نے کوئی انتخابی مہم شروع نہیں کی۔ اس سے ہم تینوں رتی، سر پرشوتم داس ٹھاکر داس اور میں سخت پریشان تھے۔ ہم جب کبھی جناح کو اس کی ضرورت محسوس کرانے کی کوشش کرتے، وہ بڑی بے نیازی سے جواب دیتے: ''بھئی، یہ تو اصل میں ووٹروں کی آزمائش ہے، میں کیوں فکر کروں؟'' اس خود اعتمادی پر ہم لوگوں کو ہنسی آ جاتی مگر عین الیکشن کے دن جو سماں دیکھنے میں آیا وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ جناح کے کچھ کہے سنے بغیر، ان کے ہندو دوستوں نے تقریباً ایک سو موٹریں بھیج دیں تاکہ ان میں ووٹر ٹاؤن ہال اور عمر کھاڑی کے پولنگ اسٹیشن تک پہنچ جائیں۔ جناح کے ان ہندو دوستوں نے انہیں خطوط بھی لکھے جن میں کہا گیا تھا کہ چونکہ انتخاب فرقہ وارانہ بنیاد پر ہو رہا ہے، اس لیے وہ ووٹ تو نہیں دے سکتے، لیکن اپنی گاڑیاں بھیج کر اگر وہ جناح کو کامیاب کرانے میں مدد دے سکتے ہیں تو یقیناً یہ مادر وطن کی ایک خدمت ہوگی۔ اس داستان کا بقیہ حصہ ''بمبئی کرانیکل'' کی اشاعت مؤرخہ 7 نومبر 1945ء میں یوں

بیان ہوا ہے:

''بمبئی کرانیکل کی اشاعت مؤرخہ 3 نومبر میں ''بیربل' ' کے نوٹ میں کچھ غلط باتیں چھپی ہیں جن کی تصحیح چاہتا ہوں۔ بیربل نے لکھا ہے کہ تقریبا بیس سال ہوئے کہ حسین بھائی لالجی نے جو جناح صاحب کے مقابلے میں مرکزی اسمبلی کے لیے کھڑے ہوئے تھے، اپنی امیدواری واپس لے لی تھی حالانکہ وہ کامیاب ہورہے تھے۔ یہ سراسر غلط ہے واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر تین امیدوار تھے...... مسٹر جناح، مسٹر صالح بھائی بڑودہ والا اور مسٹر حسین بھائی لالجی۔ پولنگ کے دن دس بجتے بجتے صاف ظاہر ہونے لگا کہ میدان کس کے ہاتھ رہے گا کیونکہ جہاں جناح صاحب کو دس ووٹ مل رہے تھے، بقیہ دو امیدواروں کو چار ملتے تھے۔ دوپہر کے قریب مسٹر بڑودہ والا نے جناح صاحب سے کہا کہ اگر وہ (جناح صاحب) ان سے اپنی امیدواری واپس لینے کو کہیں تو وہ بڑی آسانی سے ان کی بات مان لیں گے۔ جناح صاحب نے نہایت نرمی سے جواب دیا کہ ان کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ بڑودہ والا سے نام واپس لینے کی درخواست کریں۔ اگر بڑودہ والا آخری لمحے تک بھی مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں تو وہ شوق سے ایسا کر سکتے ہیں۔ اس جواب کے آدھ گھنٹے بعد بڑودہ والا، انتخاب سے دستبردار ہوگئے۔ کچھ دیر بعد جب دوسرے فریق یعنی مسٹر حسین بھائی لالجی نے دیکھا کہ جناح صاحب کو کہیں زیادہ ووٹ مل رہے ہیں تو انہوں نے بھی یہی خواہش ظاہر کی۔ جناح صاحب نے صاف انکار کردیا اور کہلا بھیجا کہ مقابلہ جاری رکھیں۔ سہ پہر تک ووٹ پڑتے رہے۔ آخر جناح صاحب اپنے دونوں حریفوں کے مقابلے میں بھاری اکثریت سے جیت گئے''۔

مخلوط انتخاب

1927ء میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ میں بنیادی زور مخلوط انتخاب پر تھا۔ مارچ میں نئی دلی میں کئی پرائیویٹ جلسے ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر بھی مسلم زعما کے کئی جلسے ہوئے۔ اس کے بعد تیس مختلف الخیال مسلم رہنماؤں کا ایک جلسہ ہوا جس میں راجہ صاحب محمود آباد، سر محمد شفیع، سر عبدالقیوم، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی جوہر، راجہ غضنفر علی خاں اور مولانا محمد یعقوب شریک تھے۔ جناح نے جلسے کی صدارت کی۔ انہوں نے جلسے کو بتایا کہ کانگریس کے صدر سری نواس آئنگر کی طرف سے پانچ تجویزیں موصول ہوئی ہیں، جو سب کی سب مخلوط انتخاب کی بنیاد پر ہیں۔ بحث کے بعد مجلس نے چند شرائط کے ساتھ مخلوط انتخاب کی بات منظور کر لی اور یہ تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوگئی۔

''کسی بھی مجوزہ دستور کے مرتب کرنے میں، نمائندگی کے طریقہ کار کے سلسلے میں حسب ذیل شرطیں، سمجھوتے کے طور پر مان لی جائیں''۔

(الف) سندھ کو بمبئی پریسڈنسی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔

(ب) شمالی مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کو عام صوبوں کی سطح پر لایا جائے۔ ایسی صورت میں ہم ان صوبوں میں مخلوط انتخاب کا طریقہ منظور کر لیں گے۔ اور اس کے ساتھ مسلمان یہ بھی مان لیں گے کہ بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہندو اقلیت کو وہی مراعات دیں گے جو مسلمان اقلیت کو ہندو اکثریت کے صوبے اپنے یہاں دیں گے۔ پنجاب اور بنگال میں نمائندگی ایک تہائی تعداد سے کم نہ ہونی چاہیے اور وہ بھی مخلوط انتخاب کے ذریعہ۔

ان تجویزوں کی مسلمان پارٹیاں تو اپنی اپنی جماعت میں توثیق کریں گی لیکن حاضر الوقت ارکان توقع کرتے ہیں کہ ہندو بھی انہیں قبول کریں گے، مسلمان بھی ان کی توثیق کریں گے۔

دوسرے دن کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور اس کا ردعمل اس تجویز کے موافق ہوا، چنانچہ سری نواس آئنگر، موتی لال نہرو، سروجنی نائیڈو اور مولانا محمد علی جوہر پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی کہ وہ مسلم کانفرنس اور ہندو فرقے کے نمائندوں سے مل کر تفصیلات طے کر لے۔

جناح ایک سچے عظیم قوم پرست تھے۔ انہوں نے مختلف الخیال مسلم لیڈروں کو ہموار کر کے ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کی نہایت مخلصانہ اور جان توڑ کوشش کی۔ ان کوششوں کی خاطر نہ سہی۔ ہندوستان کی بہبودی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کامیاب ہوتے۔ دشواریوں کے باوجود امید کی کرن دکھائی دینے لگے۔ ٹھوس تجویز سامنے تھی۔ لیکن افسوس کہ بعض شر پسند قوتوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

تخریبی کارروائی

''ٹائمز آف انڈیا'' میں ایک ہفتہ وار فیچر مضمون ''مسلمانوں کی نظر سے'' کے عنوان سے شائع ہوا کرتا تھا۔ اس فیچر میں جناح کی کوششوں کے بارے میں بعض نہایت غیر معروف اور گھٹیا قسم کے اردو اخباروں کے مضامین کے حوالے چھاپے جاتے تھے۔ اگر چہ ان اردو اخباروں کی عوام میں کوئی وقعت نہ تھی لیکن ان کے مضامین گورنمنٹ کے اورینٹل ٹرانسلیٹر کے محکمے سے ترجمہ کر کے ٹائمز آف انڈیا کو بھیجے جاتے۔ ذاتی علم کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس گورنمنٹ کا مقصد مذہبی عناد پیدا کرنا اور فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دوسری طرف کانگریسی اخبار ''بمبئی کرانیکل'' نے جناح کے خلاف یہ لکھ کر الگ محاذ قائم کیا کہ وہ پکے فرقہ پرست ہیں۔ میں نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جناح ہرگز فرقہ پرست نہیں تھے۔ کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی بڑے نرم طبیعت اور مرنجا مرنج انسان تھے۔ لیکن کانگریس ہائی کمان کی خوشنودی کی خاطر انہوں نے جناح پر رکیک جملے کسے اور ایسے ذلیل الزامات لگائے جن سے جناح کی شخصیت صرف مشتبہ ہی نہیں بلکہ مکروہ نظر آنے لگی۔ میں جانتا ہوں کہ ان جھوٹے الزاموں سے جناح کو کتنا صدمہ پہنچا تھا اور ان کا رنجیدہ ہونا بالکل درست بھی تھا۔ ان سب کا نتیجہ وہی نکلا جو رجعت پسند طبقہ چاہتا تھا اور جو حکومت چاہتی تھی۔

سائمن کمیشن

8 نومبر 1927ء کو وائسرائے (1) نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں

---

(1) لارڈ اروِن (ع ع ج)

آئینی اصلاحات کی سفارش پیش کرنے کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا ہے جس کے سربراہ سر جان سائمن ہوں گے۔ اس کمیشن کے سب ارکان انگریز تھے۔ اس نوعیت کے کمیشن کے بارے میں ہندوستان کا جو رویہ ہونا چاہیے تھا وہ ظاہر ہے۔ میں مسز بیسنٹ کے ایما پر جناح سے ملا۔ انہوں نے ایک مختصر سا بیان تیار کر کے سارے ملک میں دوستوں کے پاس بھیج دیا۔ ایک نقل مجھے دے کر بولے کہ اس پر بمبئی کے بارہ مشہور لیڈروں کے دستخط چاہئیں۔ اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میں نے مطلوبہ دستخط حاصل کر کے شام تک ان کے پاس پہنچا دیے۔ 16 نومبر 1927ء کو وہ بیان جناح نے اخباروں میں شائع کروا دیا۔ یہ بیان سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان تھا۔ جن لوگوں نے جناح کے تیار کیے ہوئے بیان پر دستخط کیے تھے ان میں سر ڈنشا پٹیٹ، سر علی امام، سر چمن لال سیتل واد، سر عبدالرحیم، سر فیروز سیٹھنا، سر پرشوتم داس ٹھاکر داس، منشی ایشور سرن، یعقوب حسن، دیوان بہادر رنگا چاریہ، ڈاکٹر شان مکھم چیٹی، سر من موہن داس رانجی، ایچ۔ پی مودی، مسز سروجنی نائیڈو، راجہ غضنفر علی خاں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، سی۔ وائی چنتامنی، سچیتا نند سنہا، سر پی شوسوآمی آئر، سر تیج بہادر سپرو اور نواب اسماعیل خان وغیرہ شامل تھے۔

لالہ لاجپت رائے اور جیکر نے علیحدہ بیان کے ذریعے اور اسی طرح دوسرے کانگریسی لیڈروں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔

مدراس میں کانگریس کا اجلاس ہوا اور کلکتے میں مسلم لیگ کا دونوں میں سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کی قراردادیں منظور ہوئیں۔

برطانوی لیبر پارٹی کے نمائندے میجر گراہم پول دونوں اجلاس میں شریک ہوئے۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا کہ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ وہ لکھنؤ اجلاس (1916ء) میں شریک ہوئے تھے اور 1927ء کے مدراس سیشن میں بھی اور ان دونوں موقعوں پر ہندو مسلم سمجھوتے کے ماتحت اتحاد عمل کا اظہار ہوا۔

بعض حیثیتوں سے لکھنؤ کے مقابلے میں مدراس کا سمجھوتا زیادہ معنی خیز تھا۔ میجر پول نے یقین دلایا کہ لیبر پارٹی دل سے خواہشمند ہے کہ ہندوستان کو جلد از جلد سوراج حاصل ہو جائے۔ لیکن

بائیکاٹ کے ایسے ہمہ گیر اعلانات کے باوجود سائمن کمیشن کا تقرر ہو گیا۔

نہرو کمیٹی

دسمبر 1927ء کے مدراس سیشن کے بعد کانگریس نے موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک سب کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد ہندوستان کے دستور کے بنیادی اصول طے کرنا تھا۔ اس کے ارکان میں مسلمانوں میں سے سر علی امام اور شعیب قریشی تھے۔ ہندو سبھا سے انے اور جیکر، سکھ لیگ کے منگل سنگھ تھے اور ان سب کے علاوہ سر تیج بہادر سپرو، این۔ ایم جوشی اور جی۔ آر۔ پردھان تھے، کمیٹی کے سیکریٹری جواہر لال نہرو تھے۔ چونکہ جناح اپریل کے اوائل ہی میں انگلستان چلے گئے تھے۔ اس لیے ان کی شمولیت کا سوال ہی نہ تھا۔

اقلیت کا مسئلہ

نہرو کمیٹی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اقلیت کا تھا۔ جمہوری خود مختار ہندوستان میں اقلیت اور بالخصوص مسلمانوں کی حیثیت کیا ہونی چاہیے؟ ملک میں ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی۔ ایسی صورت میں اس بات کا تحفظ ضروری معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی سامراج کی جگہ ہندوستان جمہوریت قائم ہو جانے پر ہندوؤں کی مستقل اکثریت کہیں مسلم اقلیت کے مفاد کے خلاف کام نہ کرے۔ ایسے تحفظ کا ایک ممکن طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول قائم رکھا جائے۔ لیکن یہ کوئی مستقل حل نہیں تھا۔ اس لیے دوسرے طریقوں پر بھی غور کرنا ضروری تھا۔

نہرو رپورٹ

نہرو کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ مرتب کر لی تو اس پر غور کرنے کے لیے اگست 1929ء میں لکھنؤ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں کانگریس کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ، مرکزی خلافت کمیٹی، ہندو مہا سبھا اور بہت سی سیاسی اور اقلیتی جماعتیں شریک ہوئیں۔

ڈاکٹر انصاری کانفرنس کے صدر تھے۔ جناح کے رفیق راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی تقریر میں 1916ء کے کانگریس اور لیگ کے معاہدے کا ذکر کیا اور امید ظاہر کی کہ اس کانفرنس میں بھی

وہی جذبہ کارفرما ہوگا اور نہرو رپورٹ کو ہر جماعت کی تائید حاصل ہو جائے گی...... لالہ لاجپت رائے، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت مدن موہن مالویہ، مولانا شوکت علی، مسز اینی بیسنٹ، محمد یعقوب، سروجنی نائیڈو اور جے۔ ایم سین گپتا نے بھی نہرو رپورٹ کو سراہا۔ اس کانفرنس میں پنڈت مالویہ نے یہ تجویز پیش کردی کہ حکومت برطانیہ سے ہندوستان کو فوراً ڈومینین کا مرتبہ دے کر ذمہ دار حکومت بنانے کا مطالبہ کیا جائے۔ اس تجویز میں جواہر لال نہرو اور ان کے کچھ دوسرے ساتھی ڈومینین کے بجائے مکمل آزادی کا لفظ چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اختلافی تقریر کی۔

22 دسمبر 1928ء کو کلکتے میں آل انڈیا کنونشن ہوا۔ اس میں نہرو رپورٹ کو آخری شکل دی جانے والی تھی۔ اجلاس میں مختلف سیاسی اور فرقہ وارانہ جماعتوں کے نمائندے شامل ہوئے۔ جس فرقہ وارانہ مسئلے کا حل نہرو رپورٹ نے تلاش کیا تھا، اس کو دوبارہ تازہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ آغا خان اس رپورٹ کے مخالف تھے۔ جناح چونکہ اپریل سے اکتوبر تک ہندوستان سے باہر رہے اس لیے رپورٹ میں ان کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ دراصل رپورٹ موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو کی تیار کی ہوئی تھی۔ جناح کلکتہ کے اجلاس میں موجود تھے۔ وہیں انہوں نے مسلم لیگ کی طرف سے فرقہ وارانہ مسئلے کو اٹھایا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کے لیے ہوں اور صوبوں کو مساوی اختیارات حاصل ہوں۔

اس مطالبے پر غور کرتے ہوئے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ان دنوں مسلم لیگ کا رویہ کانگریس سے مخالفانہ نہیں بلکہ دوستانہ تھا۔ مسلم لیگ رجعت پسند نہیں تھی۔ ایسی حالت میں کلکتہ کنونشن کے موقع پر فرقہ وارانہ مسئلے کو اٹھائے جانے کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی کہ ڈومینین کے بجائے مکمل آزادی کے مطالبہ کی۔ سری نواس آئنگر نے وہ بیان پڑھ کر سنایا جس پر ان کے علاوہ جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس اور ستیا مورتی نے دستخط کیے تھے اس بیان میں صاف صاف کہا گیا تھا ''ہم مجوزہ دستور کے اس حصے سے قطع تعلق کرتے ہیں جس سے ڈومینین حکومت کا قبول کرنا ظاہر ہوتا ہے''۔

اس پر مسز بیسنٹ اور سی۔ پی۔ راما سوآمی آئر نے ڈومینین حکومت کے حق میں تقریریں کیں۔ سر تیج بہادر نے باہمی اتحاد کی ضرورت پر ایک زبردست تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ وہ

جناح کے ایک تہائی نشستوں کے مطالبے کو منظور کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن جیکر نے جناح کی ترمیم کی مخالفت کی جس کا اثر بالآخر یہ ہوا کہ آخری ووٹنگ میں جناح ترمیم رد کر دی گئی۔

جناح کی تقریر

اپنی ترمیم کی تائید میں جناح نے بڑی مصالحانہ اور مؤثر جوابی تقریر کی جس میں انہوں نے کہا تھا

''اس مسئلے پر میں آپ کے سامنے ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں۔ آپ کو یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ ہندوستان میں دو اہم قومیں بستی ہیں...... ہندو اور مسلمان...... یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان دونوں میں اتحاد اور مفاہمت ہونی چاہیے جس کی خاطر انہیں یہ محسوس کرنا ضروری ہے کہ ان کے مفاد مشترکہ ہیں اور انہیں شانہ بشانہ آگے بڑھنا ہے''۔

جناح اقلیت کے لیے ضمانت چاہتے تھے، انہوں نے کہا:

''ہم سب اسی زمین کی اولاد ہیں۔ ہمیں ایک ساتھ رہنا ہے، ہمیں ایک ساتھ کام کرنا ہے، ہمارے آپس کے اختلافات کیسے بھی ہوں، ان سے دشمنی پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے اس سے زیادہ کسی بات سے خوشی نہیں ہوسکتی کہ میں ہندو اور مسلمانوں کو متحد دیکھوں''۔

نہرو رپورٹ کا انجام

آل انڈیا کنونشن کا جو انجام میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس کا حال میں نے ''انڈیا سوشل ریفارمر'' میں اپنے مراسلے مؤرخہ 8 جنوری 1944ء میں یوں بیان کیا تھا:

''نہرو رپورٹ کو ''نہرو'' رپورٹ کا نام دیا جانا ہی اس کی بدقسمتی تھی۔ اس سے ذاتی مخاصمت اور حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ میں کلکتے میں دسمبر 1928ء کے اس جلسے میں مسز بیسنٹ کے ساتھ پلیٹ فارم پر بیٹھا تھا جس میں آل انڈیا پارٹیز نے نہرو رپورٹ پر بحث شروع کی تھی۔ گاندھی

جی، مسز بیسنٹ، سپرو، جناح، سی۔ پی۔ راما سوآ می آئر، سروجنی نائیڈو، جیکر یہ سب وہاں موجود تھے۔ رپورٹ نے ہندوستان کا سمجھوتا بھی طے کر دیا تھا۔ سری نواس آئنگر ڈومینین حکومت کے بجائے مکمل آزادی کے مطالبے کے حق میں تھے لیکن اس میں اصول سے زیادہ ذاتیات کو دخل تھا۔ گاندھی جی یہ جانتے تھے کہ مکمل آزادی سے متعلق سری نواس آئنگر کی ترمیم کی بنیاد ان کی موتی لال کی مخالفت تھی پھر بھی وہ سری نواس آئنگر کے ہمنوا ہو گئے اور موتی لال نہرو، سپرو، جناح اور مسز بیسنٹ سے مشورہ کیے بغیر انہوں نے آئنگر سے سمجھوتا کر لیا، اگر ہندوستان کو 1929ء تک ڈومینین حکومت کا درجہ حاصل نہ ہوا تو وہ مکمل آزادی کا مطالبہ ضرور پیش کریں گے۔ گاندھی جی کے اس سمجھوتے سے سپرو، مسز بیسنٹ، جناح وغیرہ کافی جز بز ہوئے لیکن ان کے اثرات کے تحت مجبور تھے۔ اس کے بعد جیکر نے فرقہ وارانہ مصالحت کی تجویزوں کی مخالفت کی جس کے ساتھ نہرو رپورٹ کا خاتمہ ہو گیا......''

آل پارٹیز کنونشن کے فوراً بعد کانگریس کا اجلاس موتی لال نہرو کی صدارت میں ہوا جس نے نہرو رپورٹ کے سارے اچھے پہلوؤں پر پانی پھیر دیا۔ کانگریس نے اپنے آپ کو دوسری پارٹیوں سے بے نیاز کر لیا اور اس طرح باہمی تعاون کے لیے کانگریس کے دسمبر 1927ء کے مدراس سیشن میں مسلم لیگ نے جو ہاتھ بڑھایا تھا وہ جھٹک دیا گیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں گاندھی جی، ولبھ بھائی پٹیل اور جواہر لال نہرو کے ساتھ ساتھ محمد علی جناح کا بھی بڑا اہم کردار رہا ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ یہاں ان کے اور ان کی بیوی رتی کے کچھ ذاتی حالات بھی بیان کروں۔

رتی اور میں

جناح اور ان کی بیوی رتی سے میری ملاقات بڑی پرانی تھی۔ ایک زمانہ تھا ہم تقریباً روز ایک

دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مئی 1922ء کی بات ہے۔ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ رتی ایک خاص قسم کے پرانے فیشن کے سوفے پر لیٹی ہوئی کہہ رہی ہے۔ ''کانجی میری مدد کرو'' صبح آنکھ کھلی تو وہ خواب مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اگلی رات مجھے پھر وہی خواب دکھائی دیا جس میں رتی مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ تیسرے دن شام کے پانچ بجے کے قریب دفتر سے واپسی میں جناح کے مکان ساؤتھ کورٹ چلا گیا۔ رتی کے ساتھ ملے ہوئے مجھے کئی ہفتے ہو گئے تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں ان کی رہائش گاہ پر پیشگی وقت لیے بغیر جا پہنچا تھا۔ میں کار سے اترا تو جناح کا ملازم مل گیا۔ اس نے بتایا کہ رتی بیمار ہے۔ میں اسے اپنا کارڈ دے کر واپس لوٹنے ہی والا تھا کہ ملازم واپس آ گیا اور کہنے لگا۔ رتی آپ کو بلا رہی ہیں۔ ملازم مجھے برآمدے میں لے گیا میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رتی اسی طرح سوفے پر لیٹی ہوئی ہے جیسا کہ میں اسے گزشتہ راتوں سے خواب میں دیکھ رہا تھا۔ میں رتی سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ ساڑھے سات بجے جناح بھی اپنے چیمبر سے آ گئے انہوں نے مجھے مشروب نوشی کی دعوت دی اور کہا کہ رات کا کھانا کھا کر جاؤں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں پانچ بجے سے آیا ہوا ہوں، ڈنر تک نہیں ٹھہر سکوں گا۔ انہوں نے میری بات مانتے ہوئے مجھے رخصت کی اجازت دے دی''۔

اسی سال ستمبر میں پونا گیا ہوا تھا جہاں لیجسلیٹو کونسل کا اجلاس جاری تھا۔ ایک دن میں اجلاس سے اٹھا اور ایمپرس گارڈن چلا گیا۔ جہاں میں نے رتی کے لیے خوب صورت ترین گلابوں کا ایک دستہ بھجوایا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ رتی ہفتے دو ہفتے میں انگلستان روانہ ہونے والی ہیں۔ رتی کو جب پھولوں کا یہ تحفہ ملا تو اس نے دوران سفر لندن پہنچنے سے قبل 25 ستمبر کو شکریہ کا خط لکھا جس میں اس نے منجملہ دیگر باتوں کے تحریر کیا تھا:

''آپ کا خط پا کر مجھے ہمیشہ خوشی ہوگی۔ اس لیے اگر آپ کو فارغ لمحات میسر آ جائیں تو اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیں۔ اگر میں زندہ رہوں تو......''

آگے چل کر رتی نے مزید لکھا:

''ہاں ایک بات اور یاد آ گئی۔ جناح کے پاس جائیں ان سے ملاقات کر کے مجھے لکھیں وہ کیسے ہیں۔ان میں اپنے آپ کو قصداً حد سے زیادہ مصروف رکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔اب جب کہ میں ان کے خیال رکھنے اور ستانے کے لیے ان کے پاس نہیں ہوں گی۔ان کی حالت پہلے سے بدتر ہو جائے گی''۔

رتی کے اس خط سے مجھے احساس ہوا کہ جب میں مئی کے مہینے میں اسے دیکھنے گیا تھا تو یہ حادثاتی طور پر نہیں تھا بلکہ رتی نے مجھے ٹیلی پیتھی کے ذریعہ مطلع کیا تھا کہ اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔

تصوف

رتی رفتہ رفتہ تصوف کی طرف مائل ہوگئی۔وہ غیر مادی دنیا سے رابطہ قائم کرنے میں حد درجہ دلچسپی لینے لگی۔اس نے اپنے عقائد اور یقین کامل کی صداقت کو پرکھنے کے لیے بہت سے مشکل اور خطرناک تجربے کیے۔وہ براہ راست علم کی متلاشی تھی۔

21 نومبر 1924ء کو اس نے مجھے لکھا:

''ایک معاملہ ایسا ہے جس کے متعلق آپ سے بات کرنے کے لیے میں بہت بے چین ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس معاملے میں آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔تھوڑے دنوں سے میں ارواح سے رابطے قائم کرنے میں بہت زیادہ منہمک ہوگئی ہوں۔ میں اس بارے میں زیادہ جاننے اور سچائی تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ بے تاب ہوں۔ یہ موضوع بہت زیادہ مغالطے میں ڈالنے والا موضوع ہے۔ میں اس کے متعلق جتنا زیادہ سنتی ہوں اتنی زیادہ پریشان ہوتی ہوں۔اگرچہ میں اب بھی سرگرمی سے اس میں دلچسپی لے رہی ہوں۔ میرا خیال ہے آپ ہمارے شہر کے روحانی حلقوں سے ضرور روشناس ہوں گے۔ آدمی ایسے حلقے کا رکن بن سکتا

ہے۔ میں کسی مسلک سے وابستہ نہیں ہوں نہ ہی کسی عقیدے کی موید ہوں۔اب میں اس معاملے میں اتنی زیادہ کھوگئی کہ کسی تذبذب کے بغیر اسے ترک کردینا چاہتی ہوں۔ میں خود کو دوسرے لوگوں کے تجربات پر قانع نہیں کرسکتی۔ میں اپنی ایسی شناخت کو ترجیح دوں گی کہ گمنام ہو جاؤں جبکہ آپ مجھے تلاش کرتے پھریں۔ میں سچے دل سے توقع کرتی ہوں کہ آپ اس معاملے میں میری مدد کرسکیں گے''۔

دسمبر 1924ء میں بمبئی میں تھیوسوفیکل کنونشن منعقد ہوا۔اس کنونشن سے خطاب کرنے والوں میں مسز اینی بینسٹ، جے کرشنا مورتی اور جن راج داس شامل تھے۔اس کنونشن نے رتی کی صحت بحال کرنے کا ایک موقع فراہم کیا۔میری درخواست پر مسز جیمز کزنز نے رتی سے ملاقات کی اور اس کے ساتھ طویل گفتگو کی۔28دسمبر 1924ءکو رتی نے مجھے لکھا:

''مسز کزنز سے ملاقات کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں اس کے لیے تمہاری ممنون ہوں مسز کزنز ایک بڑی شاندار خاتون ہیں انہوں نے بڑے صبر و تحمل سے میری گفتگو سنی۔وہ مجھے تھیوسیوفیکل سوسائٹی کے ایک اجلاس میں بھی لے کر گئیں جہاں مسٹر جن راج داس کی تقریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ان کی بیوی ڈوروتھی بھی بڑی خوب صورت ہے۔مسز کزنز اگر دوبارہ بمبئی آئیں تو آپ مجھے ان سے ضرور ملوائیے گا۔میرا خیال ہے کہ وہ میرا مسئلہ اچھی طرح سمجھ گئی ہیں۔

آپ سے ملاقات کو بھی عرصہ ہوگیا ہے۔آپ ضرور آئیں اور جلد ملاقات کریں تاکہ ہم سابقہ موضوع پر گفتگو کا سلسلہ پھر سے شروع کرسکیں''۔

چند ماہ تک ہمارا خط کتابت کا سلسلہ موقوف رہا۔پھر 17اپریل 1925ءکو اس نے مجھے لکھا:

''ہاں میں خواب کے اندر چلنے کے بارے میں جانتی ہوں۔جس کا

آپ نے ذکر کیا ہے۔ لیکن میں سارے خواب عالم بیداری میں دیکھتی ہوں۔ آپ نے اپنے خط میں جس قسم کے تجربے کا حوالہ دیا ہے میرے نزدیک اس سے بڑھ کر خوشی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ لیکن میری دوا میں گہری نیند سے چھٹکارا دلانے والی کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ پانچ یا چھ گھنٹے کا مکمل آرام، جس میں ذہن تو سکون کی حالت میں ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس جسمانی طور پر بہت بے چینی لگتی ہے۔ خواب مجھے کبھی کبھار ہی دکھائی دیتے ہیں"۔

اسی خط میں آگے چل کر رتی نے مزید لکھا:

"میری روح بالکل جامد ہو کر رہ گئی ہے۔ اگرچہ میں بلند عزائم رکھتی ہوں اور بعض چیزوں کی خواہش کرتی ہوں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میری حقیقی تحقیق بے نتیجہ کیوں رہی ہے! میرے حصے میں پھول تو کجا، کانٹے بھی نہیں آئے۔ میں انتہائی بے آرامی سے سوچ رہی ہوں اور چاہتی ہوں کہ کوئی نفسیاتی قوتوں کا مالک میری مدد کرے"۔

میں نے اس خط کے ملتے ہی رتی کو چند کتابیں بھیجیں۔

رتی نے چند ہی روز بعد 12 اپریل کو مجھے شکریے کا خط لکھا اور یہ بھی لکھا کہ وہ یہ کتابیں "جے" کو پڑھا رہی ہے۔ (رتی جناح کو ہمیشہ "جے" کہہ کر مخاطب کرتی تھی) اس نے لکھا:

"میں دھیرے دھیرے پورے خلوص کے ساتھ "جے" کی توجہ اس معاملے کی طرف مبذول کروا رہی ہوں۔ میں نے کبھی ضد اور کبھی خوشامد کے ذریعہ اسے اسپرٹ آف آرین پڑھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ "جے" کو یہ کتاب غیر معمولی محسوس ہوئی۔ اس کتاب کی کہانی ایک غریب باورچن کے گرد گھومتی ہے جسے لندن سے پھانس کر بوسکومب لے جایا گیا اور وہاں قتل کر دیا گیا۔ اس جرم کی تفصیلات بڑی ہولناک ہیں تاہم مجرم نے

اپنے طور پر کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ مجرم کی چالاکی اور ہوشیاری نے پولیس کو چکر میں ڈال دیا تھا اور وہ بدحواس ہوگئی تھی۔ بہرحال اس نے مجرم کا سراغ لگا ہی لیا اور اسے پھانسی کے تختے تک پہنچا کر دم لیا...... جج کو اس کیس میں کوئی سقم نظر نہیں آتا تھا"۔

رتی نے مجھے اس خط میں یہ بھی تحریر کیا کہ "اب وہ اور "جے" کشمیر نہیں جا سکیں گے۔ کیونکہ "جے" باولا کے مقدمے میں بری طرح مصروف ہیں"۔

اب میں رتی کو مختلف موضوعات پر کتابیں بھیجنے لگا۔ بعض کتابوں کے بارے میں اپنے تبصرے بھی لکھ دیا کرتا تھا۔ یہ تبصرے رتی کے علاوہ جناح کی نظر سے بھی گزرتے تھے اور وہ انہیں پڑھ کر محظوظ ہوا کرتے تھے۔

13 مئی 1925ء کو مجھے اڈیار (مدراس) سے مسز ڈوروتھی جن راج داس کا ایک خط موصول ہوا۔ انہوں نے لکھا کہ:

"اگر میں کم سنی کی شادی اور مزدوروں خصوصاً خواتین مزدوروں کے مسائل کے بارے میں کچھ لکھ سکوں تو وہ میری بڑی ممنون ہوں گی۔ ساتھ ہی انہوں نے لکھا کہ اگر ان کا بمبئی آنا ہوا تو وہ مسز جناح سے ایک مرتبہ پھر ضرور ملیں گی۔"

مسز ڈوروتھی، رتی کی ذہانت سے بے حد متاثر ہوئی تھیں۔

کچھ دن بعد میں نے رتی کی درخواست پر مسز ڈوروتھی کو ایک خط لکھا جس میں اڈیار میں واقع لڑکیوں کے تھیوسیوفیکل اسکول کے بارے میں معلومات حاصل کی گئی تھیں۔ رتی اپنی چھ سالہ بچی دینا کو اس اسکول میں داخل کروانا چاہتی تھی۔

ڈوروتھی نے اس خط کے جواب میں مجھے لکھا کہ:

"تھیوسیوفیکل اسکول، جناح کی بچی کے لیے بڑا مناسب رہے گا اور یہ بھی کہ یقیناً جناح کی بچی اپنے والدین کی طرح بڑی ذہین ہوگی"۔

دو ماہ بعد ڈوروتھی نے پھر ایک خط میں تھیوسیوفیکل اسکول کے بارے میں معلومات فراہم کیں اور پوچھا کہ مسز جناح نے اب تک اپنی بچی کو اس اسکول میں کیوں داخل نہیں کروایا ہے۔

ادھر 1925ء میں تقریباً پورے سال میں رتی سے ہفتے میں کم وبیش 3،4 مرتبہ ضرور ملتا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ہماری خط کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اسی برس دسمبر میں اڈیار (مدراس) میں جوبلی تھیوسیوفیکل کنونشن منعقد ہونے والا تھا۔ میں اس کنونشن میں اپنی بیوی اور چار سالہ بیٹے کے ساتھ شریک ہونے جارہا تھا۔ رتی نے میرا پروگرام سنا تو وہ بھی ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس نے جناح کو بھی ساتھ لے جانا چاہا مگر جناح ان دنوں علی گڑھ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مصروف تھے۔

بدقسمتی سے جب ہم بمبئی سے روانہ ہونے لگے تو رتی کی بلی بیمار ہوگئی۔ چنانچہ وہ ہمارے ساتھ نہیں جا سکی۔ ایک ہفتے بعد جب اس کی بلی صحت یاب ہوگئی تو وہ اڈیار چلی آئی۔ جن راج داس نے رتی کا شایان شان استقبال کیا اور اسے مندوبین کے لیے بنائے گئے خیموں کے بجائے مدراس کے ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرایا۔

وہ روزانہ اڈیار آتی اور اجلاس میں شرکت کرتی۔ ایک شام مسز بیسنٹ اسے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ اور اس کے ساتھ تقریباً آدھا گھنٹہ گفتگو کرتی رہیں۔ رتی نے انہیں بتایا کہ شروع شروع میں اس کا ارادہ تھیوسیوفیکل سوسائٹی میں شامل ہونے کا تھا مگر اب وہ اس ارادے سے باز آ چکی ہے۔

مسز بیسنٹ نے بعد میں مجھ سے کہا:

''اپنی عظیم دوست کا خیال رکھو۔ وہ بڑی دکھی نظر آتی ہے''۔

جب میں نے حیرانی کا اظہار کیا تو مسز بیسنٹ نے وضاحت کی

''کیوں کیا تمہیں اس کی آنکھوں میں دکھ کی لہر نظر نہیں آتی؟ اسے غور سے دیکھو!''

اسی کانفرنس کے دوران ایک شام لیڈی ایملی لیوٹائنز نے رتی کو ڈنر پر مدعو کیا۔ اس ڈنر میں

تقریباً 25 مہمان موجود تھے۔ جن میں کرشنا مورتی، بنی اور میری، لیڈی ایملی کی بیٹیاں، ڈیوڈ گراہم پول، سیوا کامو، رتن سی ڈی مرار جی، رتھ رابرٹس، ہیلن ناتھی، دوارکا ناتھ تیلانگ، میں اور کئی دوسرے افراد شامل تھے۔

اسی ہفتے ایک شام میں اور رتی جن راج داس کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ رتی نے جن راج داس سے کسی چیز پر جادو کا مظاہرہ کر کے دکھانے کو کہا۔ جن راج داس نے تیزی سے جواب دیا:

"آپ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں! آپ کا دوست کانجی، اسے مجھ سے بہتر کر کے دکھا سکتا ہے"۔

انگلستان کا سفر

1925ء میں محمد علی جناح کو سینڈھرسٹ کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا جس کے سربراہ جنرل اسکین تھے۔ 1926ء کے اوائل میں جناح کو اس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے انگلستان جانا پڑا۔ اس سفر میں رتی بھی ان کے ساتھ تھی۔ سفر سے پہلے رتی نے مجھے لکھا:

"کانجی، میں چند ماہ کے لیے یورپ اور امریکہ کے دورے پر جا رہی ہوں۔ میری حفاظت اور امداد کے لیے آپ میرے ساتھ نہیں ہوں گے اس لیے براہ کرم میرے لیے کسی چیز پر کوئی مقناطیسی عمل کر دیں تا کہ میں آپ کے ساتھ رابطہ قائم رکھ سکوں"۔

جب میں نے اس عمل کے سلسلہ میں پیش و پس کیا تو رتی نے مجھے ایک خوب صورت نیلم دیا، جو وہ ہمیشہ پہنا کرتی تھی۔ میں نے اس نیلم پر محبت اور تحفظ کا ایک مقناطیسی عمل کیا اور رتی کو لوٹا دیا۔

رتی اگست 1926ء کے آخری ہفتے میں وطن لوٹی۔ یکم ستمبر کو اس نے مجھے لکھا کہ میں فوراً اس سے ملوں اور اس کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ اس نے مزید لکھا کہ صرف وہ ہی نہیں بلکہ "جے" بھی میرے منتظر ہوں گے۔

جب میں ان کے گھر پہنچا تو رتی خوشی سے چلانے لگی۔ "میرے اللہ، تم نے نیلم پر کیا عمل کیا تھا"۔ میں نے پوچھا "کیوں، کیا ہوا!" رتی بولی "میں نے تین مرتبہ حاضرات کا عمل کرنا چاہا۔

ایک مرتبہ میری ٹرین چھوٹ گئی دوسری مرتبہ میرا معمول، آنا بھول گیا اور تیسری مرتبہ میں خود سب کچھ بھول گئی"۔

رتی میری بڑی ممنون نظر آتی تھی کہ میرے "جادوئی عمل والے نیلم" کی بدولت حاضرات کے عمل سے اس کی جان چھوٹ گئی۔ جناح ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ تمام وقت رتی اور مجھ پر ہنستے رہے۔ لیکن پھر جناح نے بھی میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے رتی کو ایک بے کار اور خطرناک عمل سے نجات دلوادی۔

کچھ دنوں بعد رتی پر پرانی کیفیت پھر غالب آنے لگی۔ اس نے مجھے لکھا:

"میرا خیال ہے کہ ہم سب کو حزن و ملال کے لمحات سے اس وقت واسطہ پڑتا ہے جب ہمیں ہر چیز راستے کی رکاوٹ نظر آتی ہے اور کچھ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ ایک قسم کے انتظار کی ذہنی کیفیت! آدمی انتظار کرتا ہے اور انتظار کرتا ہے، یہاں تک کہ زندگی پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے"۔

اسی خط کے آخر میں رتی نے لکھا:

"میں دوبارہ بالکل ٹھیک ہوگئی ہوں۔ اگر میرے پاؤں خراب اور سوجے ہوئے نہ ہوتے تو میں معمول کے مطابق چلتی پھرتی۔ میں اپنے دوستوں سے ملنے جاتی ہوں اور آج رات سینما جارہی ہوں۔ خواب گاہ کے سلیپر پہن کر، کیونکہ دوسرے جوتے اتنے بڑے نہیں ہیں کہ ان میں میرے خوب صورت پاؤں سما سکیں۔ اگر ایکس رے لیا جاتا تو پتہ چل سکتا تھا کہ ٹوٹی ہوئی سوئی ابھی میرے پاؤں میں ہے اس لیے میں کوشش کررہی ہوں کہ ہمت کر کے دوسرا آپریشن کروالوں"۔

فرصت کے مشاغل

اب رتی کا زیادہ تر وقت مختلف پالتو جانوروں، بلیوں اور کتوں پر صرف ہوتا تھا وہ ان میں سے ہر ایک کو پیار کرتی، ان کی دیکھ بھال کرتی اور ان کے علاج پر بچوں جیسی توجہ دیتی تھی کیونکہ دینا

تو سارا دن اسکول میں یا اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھر سے باہر رہتی تھی۔

مگر رتی کی بدقسمتی نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور رتی کی تمام تر دیکھ بھال کے باوجود اس کے پالتو جانور ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ اب رتی اور میں نے بمبئی (بلیشور) چیمبر اور کلیان کے پنجرہ پولوں پر (اپاہج جانوروں کی دیکھ بھال کا ادارہ) پر کام کرنا شروع کیا کہ وہاں رہنے والے جانور کس حالت میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ کئی ماہ کی محنت کے بعد ہم نے پنجرہ پول کے ٹرسٹیوں کو ایک خط لکھا جس میں صرف ان پنجرہ پولوں کی حالت زار بیان کی گئی تھی بلکہ ان کی اصلاح کے لیے مختلف تجاویز بھی پیش کی گئی تھیں۔ ہم نے صرف انہی کو نہیں بلکہ اخبارات میں بھی لکھا۔ ایسا ہی ایک خط کا جو 2 ستمبر 1927ء کو ہندوستان کے مختلف اخبارات میں شائع ہوا، بڑا اچھا ردعمل ہوا اور بعض قارئین نے، جن میں مسز سروجنی نائیڈو بھی شامل تھیں، ہمارے کام کی حوصلہ افزائی کی۔

رتی اور مجھ میں بے انتہا ذہنی ہم آہنگی تھی۔ اسے بے خوابی کی بیماری تھی جس کے باعث اس کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ مگر جب میں اس کے ساتھ ہوتا اور وہ مجھ سے کہتی ''میں بے حد تھکی ہوئی ہوں مگر مجھے نیند نہیں آ رہی'' تو مجھے صرف ''رتی، سو جاؤ'' کہنا ہوتا اور وہ گہری نیند سو جاتی۔ کبھی کبھار وہ مجھ سے یہ بھی کہتی ''اگر میں سو گئی تو تم چلے جاؤ گے'' میں اس سے کہتا ''تم سو جاؤ...... میں کہیں نہیں جاؤں گا اور یہیں بیٹھا کتاب پڑھتا رہوں گا''۔ اگلے ہی لمحے وہ چین کی نیند سو چکی ہوتی۔ کبھی کبھی رات گئے میرے فون کی گھنٹی بجتی۔ دوسری طرف رتی ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی ''مجھے نیند نہیں آ رہی......'' میں اس سے فون پر ہی کہتا ''رتی جاؤ اور سو جاؤ'' اگلی صبح وہ مجھے فون کر کے میرا شکریہ ادا کرتی۔ میں مسز بیسنٹ سے کہا کرتا کہ رتی مجھ پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کے اعتماد پر پورا نہ اتر سکوں۔ مسز بیسنٹ مجھ سے کہتیں کہ میں اس بارے میں زیادہ فکر مند ہوں اور حتیٰ الوسع رتی کی توقعات پر پورا اترنے کی پوری کوشش کرتا رہوں۔

رتی میرے سماجی اور فلاحی کاموں میں بھی بڑی دلچسپی لیتی تھی۔ وہ اور جناح دونوں میری

حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ رتی میرے لیے کام میں دلچسپی کا ایک بڑا محرک بن چکی تھی۔ مسز بیسنٹ کے بعد وہی تھی جو نہ صرف مجھ میں بلکہ میرے کام سے گہری دلچسپی رکھتی تھی۔

جن دنوں میں بازار حسن میں رہنے والی مظلوم عورتوں کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا اور ان پر ڈھائے جانے والے اخلاق سوز مظالم کا کھوج لگا رہا تھا تو رتی اور جناح دونوں نے اس مسئلہ پر مجھ سے کئی مرتبہ تبادلہ خیال کیا اور مفید مشورے دیے۔ وہ دونوں عورتوں کے اس مظلوم طبقے سے روا رکھے جانے والے غیر انسانی سلوک کو ختم کروانا چاہتے تھے اس کے لیے ہم نے مشترکہ طور پر کئی اقدامات کیے اور ان میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب میں نے 22-1921ء میں اپنا پہلا سروے کیا تو اس وقت بازار حسن میں چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی تھی لیکن 1928ء میں وہاں کوئی بچہ موجود نہیں تھا۔ وہ تمام بچے پولیس نے اٹھا کر امر کھاڑی کے چلڈرن ہوم میں پہنچا دیے تھے۔

ہماری کوششوں کے باعث 1924ء میں ایک خصوصی ضابطہ قانون وضع ہوا جس کی رو سے سولہ برس سے کم عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو غیر صحت مند، برے اور مخرب الاخلاق ماحول سے نکالنا ممکن ہوگیا...... یہ الگ بات ہے کہ اس قانون پر عملدر آمد مئی 1927ء میں شروع ہوا۔

یہی نہیں، رتی بازار حسن کے حالات اور مسائل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ، مس ڈیوس اور میں کئی مرتبہ ان علاقوں میں کئی کئی گھنٹے تک گھومتے رہے اور ایک کے بعد دوسرے علاقے کی خاک چھانتے رہے۔

جناح اور رتی کی علیحدگی

جنوری 1928ء میں کلکتہ مسلم لیگ کے اجلاس سے واپسی پر رتی اور جناح میں علیحدگی ہوگئی۔ میں اس کا ذمہ دار ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قرار نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی سبب تھا تو وہ صرف مزاج اور عمر کا فرق تھا۔ رتی کو انتقال کیے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن میں ذاتی علم کی بنا پر آج بھی یہی کہوں گا کہ وہ آخری دم تک جناح سے محبت کرتی رہیں۔ 3 اپریل

1928ء کو جناح انگلستان گئے۔ اس کے ایک ہفتے بعد رتی بھی لندن پہنچ گئی۔ (1) اس سال اگست اور ستمبر کے درمیان رتی پیرس میں سخت بیمار پڑیں۔ اس وقت میاں بیوی میں مفاہمت ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب جناح کو رتی کے نرسنگ ہوم میں داخل ہونے کی خبر ملی تو وہ فوراً پیرس پہنچے اور اسی نرسنگ ہوم میں مقیم ہوئے۔ بعد میں مجھے رتی نے بتایا کہ جناح وہیں بیٹھ کر کھانا کھاتے اور وہی پرہیزی غذا کھاتے جو رتی کے لیے پکائی جاتی۔ اس کے بعد رتی اپنی ماں کے ساتھ ہندوستان لوٹیں۔ جناح بھی واپس آ گئے۔ یہ اکتوبر کے وسط کی بات ہے (2)۔

رتی کی بیماری

اس کے بعد میں رتی سے مستقل ملتا رہا سوائے دسمبر کے چند ایام کے، جب مجھے مسز بیسنٹ کے حکم پر کلکتہ میں ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت کے لیے کلکتہ جانا پڑا۔ میں اس کانفرنس میں قطعاً جانا نہیں چاہتا تھا مگر مسز بیسنٹ نے مجھے تار بھیج کر بلوالیا۔ میں ان کی حکم عدولی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جنوری اور فروری 1929ء میں رتی بیمار رہیں جس کی وجہ سے وہ بڑی پژمردہ رہا کرتی تھیں۔ جناح ہر روز شام کے وقت ان سے ملنے جایا کرتے تھے، اور جب میں ان دونوں کے ساتھ ہوتا تو بیتے دنوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اب جناح اور رتی باہمی مفاہمت کی طرف آ رہے تھے۔ گو آل پارٹیز کانفرنس، فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہی تھی لیکن جناح کو اس سے زیادہ تردد نہیں ہوا کیونکہ وہ وہ سمجھتے تھے کہ ایک نہ ایک دن مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتا ہو جائے گا۔

17 فروری کی صبح کو میں مسز بیسنٹ کے استقبال کے لیے اسٹیشن گیا، دوپہر کا کھانا ان کے

---

(1) ہیکٹر بولائھو نے اپنی کتاب JINNAH:THE CREATOR OF PAKISTAN میں لکھا ہے کہ رتی اپنی والدہ کے ہمراہ 10 اپریل 1928ء کو پیرس کے لیے روانہ ہوئی تھیں اور قائداعظم ان کی روانگی سے پہلے نہیں بلکہ کوئی ایک ماہ بعد ایس ایس راجپوتانہ سے سری نواس آئنگر اور دیوان چمن لال کی معیت میں یورپ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ (ع ع ج)۔ (2) رتی نے دوران سفر 5 اکتوبر 1928ء کو مارسیلز سے قائداعظم کو ایک نہایت ہی پردرد اور محبت بھرا خط لکھا تھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ ان کو اتنا چاہتی ہیں جتنا کوئی مرد کبھی نہیں چاہا گیا، وہ المیہ جو محبت سے شروع ہوا تھا محبت پر ہی ختم ہونا چاہیے۔ رتی کا یہ خط نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد میں محفوظ ہے اور اس کا عکس اور مکمل ترجمہ راقم کی کتاب قائداعظم کی ازدواجی زندگی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ (ع ع ج)

ساتھ کھا کر گھر پہنچا تو رتی آ گئیں۔ وہ بے حد ملول اور بجھی بجھی سی تھیں۔ وہ تقریباً چار گھنٹے میرے گھر رہیں۔ میں نے ان کے لیے چائے بنائی۔ ان کی حالت دیکھتے ہوئے انہیں تنہا چھوڑنا مناسب نہ تھا، اس لیے شام کی چائے کے لیے میں مسز بیسنٹ کے یہاں بھی نہ جا سکا۔ سات بجے کے قریب میں نے رتی کو ان کے گھر چھوڑا اور وعدہ کیا کہ مسز بیسنٹ سے ملنے کے بعد سوا دس بجے رات تک ان کے پاس آ جاؤں گا۔ لیکن جب وہاں رات کو پہنچا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ رتی بے ہوش پڑی تھیں۔ کچھ دیر بعد انہیں ہوش آیا۔ دوسرے دن یعنی 18 فروری کی صبح ان کا پیغام ملا کہ دفتر جاتے ہوئے ان سے ملتا جاؤں۔ اس دن وہ بے حد افسردہ نظر آئیں۔ کچھ تو انکی دل بستگی کی خاطر اور کچھ انہیں خوش کرنے کے لیے میں نے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پوچھا ''اب میں رات کو پھر ملوں گا'' کہہ کر ان سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے بڑی افسردگی سے جواب دیا ''اگر زندہ رہی تو! ورنہ میری ان بلیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا۔ کسی اور کو نہ دے دینا''۔ رتی کے یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے۔ میں رات کے کھانے پر اندھیری میں ایک جگہ مدعو تھا۔ وہاں سے سوا گیارہ بجے لوٹا تو سید حارتی کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہیں۔ میں بھی دو راتوں سے سو نہیں پایا تھا۔ اپنے گھر چلا آیا۔

رتی کی وفات

اگلے دن سہ پہر کو فون پر اطلاع ملی کہ رتی پھر بے ہوش ہو گئی ہیں اور جینے کی کوئی امید باقی نہیں ہے۔ میں اسی وقت ان کے گھر گیا۔ لیکن انہیں نہ دیکھ سکا۔ 20 فروری کو رتی کی سالگرہ تھی لیکن ٹھیک اسی تاریخ کو وہ اس دنیا سے چل بسیں۔ جناح جو ان دنوں دلی میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن میں مصروف تھے بڑی مشکل سے 22 فروری کو بمبئی پہنچ سکے۔ گرانٹ روڈ اسٹیشن پر کرنل سوکھے، ان کی بیوی اور میں جناح کو لینے گئے۔ اس وقت سے لے کر تجہیز و تکفین تک یعنی پورے پانچ گھنٹے میں جناح کے ساتھ رہا۔ میں جانتا تھا کہ خود رتی دفن کیے جانے کے بجائے (ہندوؤں کے طریقے سے) جلائی جانا پسند کرتی تھیں۔ یہ بات میں نے جناح سے بھی کہی لیکن وہ نہ مانے اور انہوں نے رتی کی تدفین اسلامی طریقے سے کرنے کا انتظام کیا۔ سارا وقت جناح

بڑے ضبط اور ہمت سے کام لیتے رہے۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے یکا یک بڑی روانی کے ساتھ اسمبلی کی کارروائیوں کا ذکر شروع کر دیا۔ وہ اسمبلی کے اسپیکر وٹھل بھائی پٹیل کا ذکر کر کے کہنے لگے کہ کس طرح وہ حکومت کے خلاف ایک پیچیدگی میں پڑ گئے تھے اور پھر کیسے انہوں نے وٹھل بھائی کی دستگیری کی اور دوسری باتوں کا بھی کرنے لگے۔ لیکن یہ بات چھپ نہیں رہی تھی کہ جناح کا دل رو رہا ہے اور وہ بے محل گفتگو چھیڑ کر اپنے جذبات کو چھپانے کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سب اسی وقت تک ہوتا رہا جب تک جنازہ قبر کے پاس رکھا تھا، لیکن جونہی رتی کی لاش قبر میں اتاری گئی اور جناح سے مٹی دینے کو کہا گیا تو ضبط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دیر تک بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ میں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور امنڈتے ہوئے آنسوؤں اور بوجھل دل ساتھ رتی کی حسین روح کے بے جان جسم کا دیدار کیا۔ تدفین کے بعد جناح نے مجھ سے کہا کہ میں اگلی شام ان سے ملوں وہ جاننا چاہتے تھے کہ موت سے پہلے کے چند ہفتوں میں رتی پر کیا گزری۔ یہ بات انہیں میرے علاوہ اور کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ (1)

رتی کے بعد

رتی کی وفات کے بعد میں نے جتنی تلخی اور افسردگی جناح کی زندگی میں دیکھی اس سے پہلے کسی اور شخص میں نہیں پائی تھی۔ میرے سامنے انہوں نے گویا اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ وہ دو گھنٹے تک مسلسل بولتے رہے اور میں سنتا گیا۔ بیچ میں کبھی دو ایک لفظ ہمدردی کے کہہ دیتا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے جناح کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔ ان کے لیے بیوی کی موت صرف ایک المناک سانحہ یا مرضی مولا کا کرشمہ ہی نہیں تھا بلکہ اس میں انہیں اپنی ناکامی کی جھلک نظر آتی تھی، زندگی میں ذاتی شکست محسوس ہونے لگی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس صدمے کو اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بھلا نہ سکے۔

---

(1) کانجی دوارکاداس نے رتی جناح کے حالات پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام RUTTIE JINNAH:THE STORY OF A GREAT FREINDSHIP تھا۔ یہ کتاب رتی کی وفات کے 33 برس بعد 1962ء میں شائع ہوئی اس سے قبل کانجی اپنی کتاب GANDHIJI:THROUGH MY DIARY LEAVES کا انتساب بھی رتی کے نام کر چکے تھے۔ (ع ع ج)

حزن وتنہائی

جناح کی ذاتی اور سیاسی زندگی ہر ممکن حد تک صاف ستھری، پاکیزہ اور ہر طرح سے بے لوث رہی۔ انہوں نے 1916ء میں ماؤنٹ پلیزینٹ روڈ پر انیسویں صدی کے طرز کا بنا ہوا بنگلہ ''ساؤتھ کورٹ'' خریدا تھا۔ ان کی شادی کے بعد سے یہ مکان میرے لیے بھی اپنا ہی گھر بن چکا تھا۔ اس کی چھت کے نیچے مجھے رتی اور جناح کی دوستی اور اعتماد ملا۔ بمبئی میں جناح میرے لیے سیاسی رہنما تھے اور دوست بھی۔ میرے دل میں ان کی انتہائی عزت تھی۔ 1918ء میں شادی کے بعد ان کی ازدواجی زندگی بڑی دل نواز رہی۔ وہ رتی سے بڑی حد تک انسپریشن حاصل کرتے تھے۔ ان کی ذاتی اور سماجی زندگی ہی نہیں بلکہ سیاسی زندگی بھی رتی کے ساتھ ساتھ گزری۔ رتی ان کے ساتھ رہا کرتی تھیں اور اپنے شوہر کو ہر طرح سے بے فکر اور پر کیف بنائے رکھتی تھیں۔ شادی کے بعد جناح نے اوریئنٹ کلب سے (جہاں وہ شطرنج اور بلیرڈ کھیلا کرتے تھے) استعفیٰ دے دیا۔ انہیں تاش سے کبھی رغبت نہیں رہی۔ قسمت آزمائی سے انہیں سخت نفرت تھی۔ رتی کی موت نے انہیں بالکل تنہا کر دیا تھا۔ وہ اس تنہائی سے نکل نہ سکتے تھے۔ اس کیفیت نے ان کی زندگی میں تلخی پیدا کر دی تھی، اور مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ ان کے ذاتی نقصان سے پیدا شدہ یاس وحزن کی تلخی ان کی سیاسی زندگی میں بھی داخل ہو گئی تھی۔ بیوی کی موت کے انیس برس بعد بھی ان کی یہ حالت باقی رہی اور اس نے ان کی سیاست کو بھی متاثر کیا۔ یہ سارے واقعات ایک دردناک داستان کے افسوس ناک باب ہیں۔

مزاج میں تبدیلی

رتی کے بعد جناح تنہائی پسند ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ایک وقت تھا کہ وہ شگفتہ مزاجی اور شائستگی کا نمونہ تھے۔ لیکن اب ان کی شخصیت میں انانیت کے حلقے پڑنے لگے۔ تنقید شاق گزرنے لگی، طنز، دشنام طرازی، غلط فہمی اور غلط بیانی برداشت سے باہر ہونے لگی۔ اگر کسی نے غلطی سے یا غیر ارادی طور پر کوئی ایسی بات کر دی تو انہوں نے اسے کبھی معاف نہیں کیا۔ رتی کی موت کا اثر ان پر غیر معمولی حد تک پڑا تھا۔ اپنی زندگی کے بقیہ انیس سال میں انہوں نے اس کا نہ تو نام لیا اور نہ

اس کا کوئی ذکر آنے دیا۔ یہاں تک کہ ان کے گھر میں اس کی کوئی تصویر بھی نہ تھی۔ رتی نے بڑے شوق سے یشب کی بنی ہوئی چیزوں کے نایاب نمونے جمع کیے تھے۔ اس کے پاس کتابوں کے بعض نادر پہلے ایڈیشن موجود تھے۔ یہ سب چیزیں میوزیم کی زینت بن سکتی تھیں لیکن جناح نے ان کو بڑے بڑے صندوقوں میں ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

رتی کی قوم پرستی

آج یہ قیاس کرنا دشوار ہے کہ رتی زندہ رہتیں تو جناح کے سیاسی عقیدے پر ان کا اثر کس طرح وار کس حد تک پڑتا۔ رتی سخت قسم کی قوم پرست تھیں۔ فرقہ واریت انہیں چھو تک نہیں گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتیں تو جناح انہیں اپنے گھر بلا لیتے اور دونوں کی زندگی انتہائی خوش گوار اور پرلطف ہوتی۔ رتی مجھ سے ہر روز پوچھا کرتی تھیں، مرکزی اسمبلی میں جناح کیسا کام کر رہے ہیں؟ کانگریسی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ جناح پر فرقہ وارانہ رنگ چڑھ رہا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ چونکہ رتی ایک کٹر قوم پرست تھیں، ایسی خبریں سن کر ان کا بے چین ہو جانا قدرتی بات تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگریسی پریس اور کانگریسی لیڈر بلاوجہ جناح کو بدنام کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ رتی گو عملی سیاست سے علیحدہ رہیں لیکن وہ جناح کی زندگی میں بے حد معاون تھیں۔ جناح کو قوم پرست رکھنے میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔

بد دماغی

کیا جناح بد دماغ تھے؟ اس سوال کا جواب میں نے ایک واقعہ کے حوالے سے ''ٹائمز آف انڈیا'' کی 22 نومبر 1953ء کی اشاعت میں یوں دیا تھا:

> ''چونکہ جناح ریاست حیدر آباد میں سر مرزا اسماعیل کے وزیر اعظم بننے پر معترض ہوئے تھے اس لیے مؤخر الذکر نے ایک چھوٹی سی بات کو جناح اور نظام حیدر آباد کے درمیان رائی کا پہاڑ بنا کر اپنی ذکی الحسی کا ثبوت دیا ہے۔ یقیناً جناح بجا طور پر بعض ایسے مسلم لیڈروں سے چڑے ہوئے تھے جو اپنے آپ کو قوم پرست مسلم کہتے تھے اور جو کانگریس ہائی

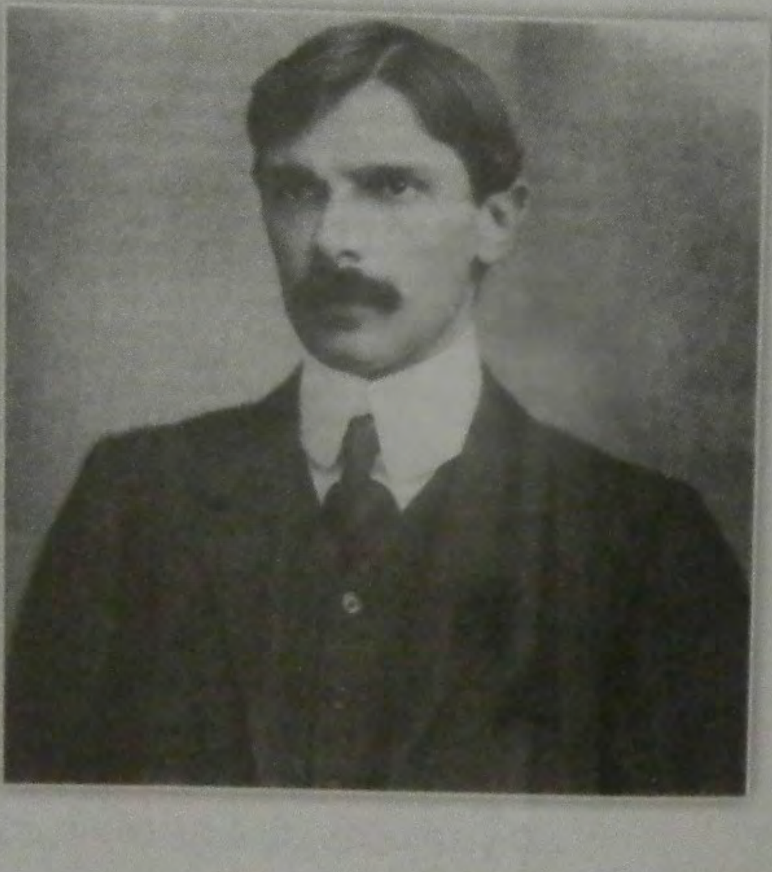
کمان کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر جناح کے خلاف سب وشتم سے
کبھی نہیں چوکتے تھے۔ بعد کے واقعات جن کا اختتام 1948ء کے
پولیس اسٹیشن میں ہوا اور جن کا ذکر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سیکریٹری کیمبل
جانسن کی کتاب THE END OF A MISSION میں
وضاحت کے ساتھ موجود ہے صاف ظاہر کرتے ہیں کہ نظام کا طریقہ کار
دانشمندانہ اور دور اندیشی پر مبنی نہ تھا۔ جناح اگر نظام کے سامنے ٹانگیں
پھیلائے سگار پیتے رہے تو اس سے نخوت کا اظہار مقصود نہیں تھا...... یاد
رہے کہ جناح دراز قد اور اپنی لمبی پتلی ٹانگوں کی وجہ سے ہمیشہ پیروں کو
آگے کر کے بیٹھا کرتے تھے۔ وہ مسلسل سگریٹ پینے کے عادی تھے"۔

اخلاق اور جرأت

میں یہاں ایسے دو واقعات کا ذکر کروں گا جن میں ایک سے جناح کی شائستگی اور دوسرے سے ان کی جرأت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پہلا واقعہ یکم نومبر 1929ء کو خود میرے گھر پیش آیا۔ مسز بیسنٹ میرے یہاں مہمان تھیں۔ اس کا ذکر میں نے جناح سے کیا انہوں نے مسز بیسنٹ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ طے یہ پایا کہ اگلے روز وہ ہائی کورٹ جاتے ہوئے دس بجے دن کو میرے یہاں آجائیں گے۔ حسب معمول وہ ٹھیک وقت پر آگئے جب میں انہیں مسز بیسنٹ کے کمرے کی طرف لے جارہا تھا تو میری نظر ان کی سگریٹ پر پڑی۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ مسز بیسنٹ تمباکو نوشی کو بہت ناپسند کرتی تھیں۔ یکایک مجھے اس کا دھیان آگیا اور میں نے زور سے کہا "جناح سگریٹ پھینک دو"۔ وہ فوراً سمجھ گئے۔ سگریٹ پھینکتے ہوئے بولے معاف کرنا کانجی مجھے یاد نہ رہا۔ تمہارا شکریہ! پھر ہم مسز بیسنٹ کے کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔ جناح کی طرف دیکھ کر بولیں کوئی بات نہیں ہے تم شوق سے سگریٹ پی سکتے ہو۔ جناح نے کہا نہیں نہیں مسز بیسنٹ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا ہے اچھا ہوا کانجی نے مجھے ٹوک دیا۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔



قائداعظم اور رتن بائی کا ایک تصوراتی رپورٹریٹ، مصور جناب ایس ایم خالد



قائداعظم محمد علی جناح



قائداعظم 1916ء میں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کے مشترکہ
اجلاس میں بطور صدر، جس کے بعد انہیں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا خطاب ملا



1918ء کی ایک یادگار تصویر، اس تصویر میں قائداعظم کے علاوہ مسز اینی بیسنٹ، کانجی
دوآرکاداس، عمر سوبانی، سید حسین، ڈاکٹر ایم آر جیاکار اور بی جی ہارنی مین کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے



سر ڈنشا مانک جی پٹیٹ (بارونٹ دوم)



موتی لال نہرو



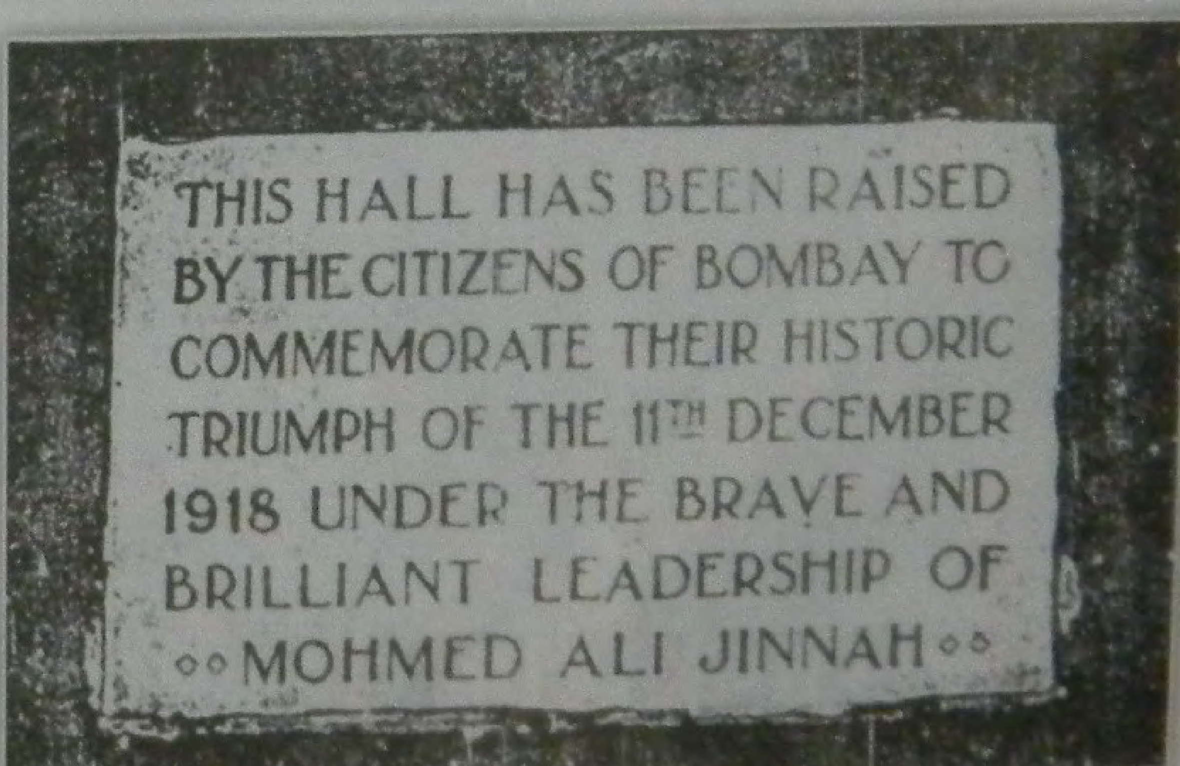
سروجنی نائیڈو



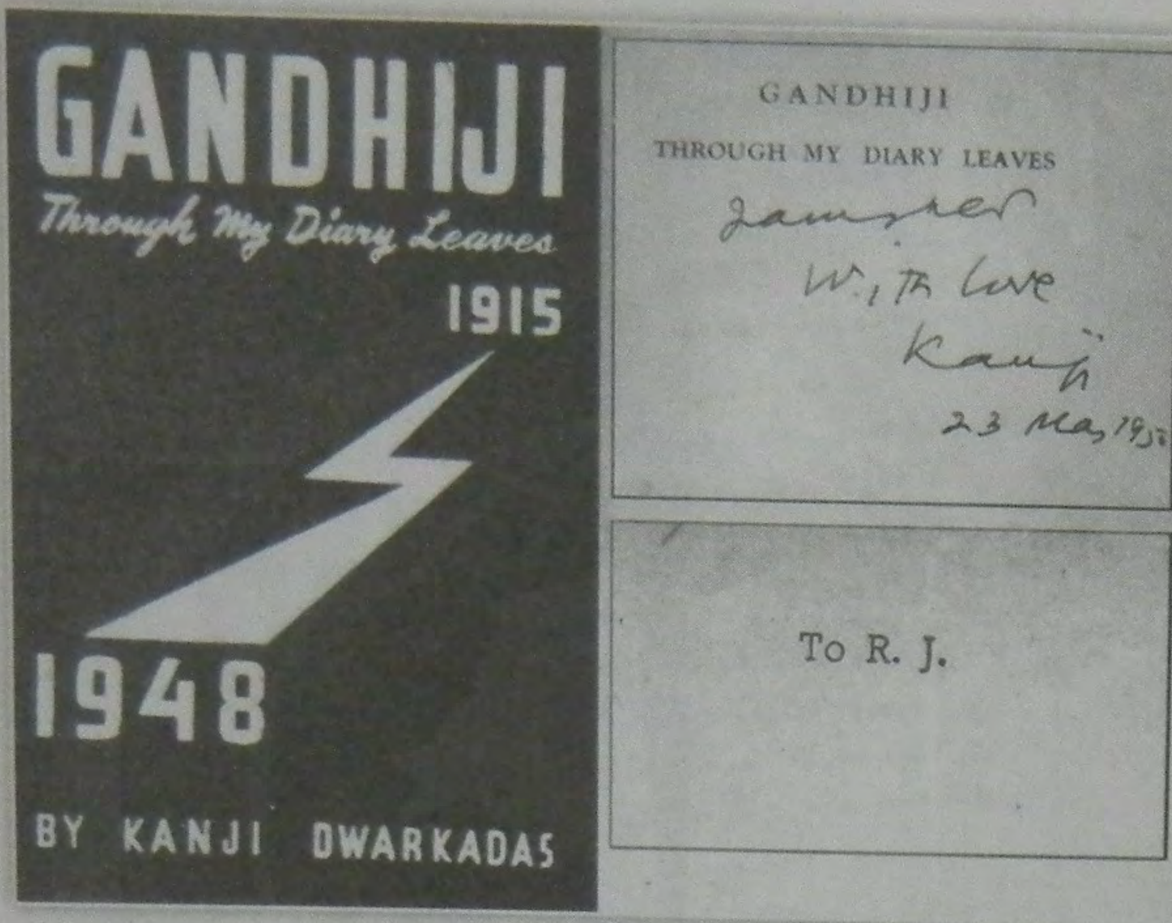
مسز اینی بیسنٹ



جناح پیپلز میموریل ہال، ممبئی
کا داخلی دروازہ



جناح پیپلز میموریل ہال، ممبئی میں نصب یادگاری تختی



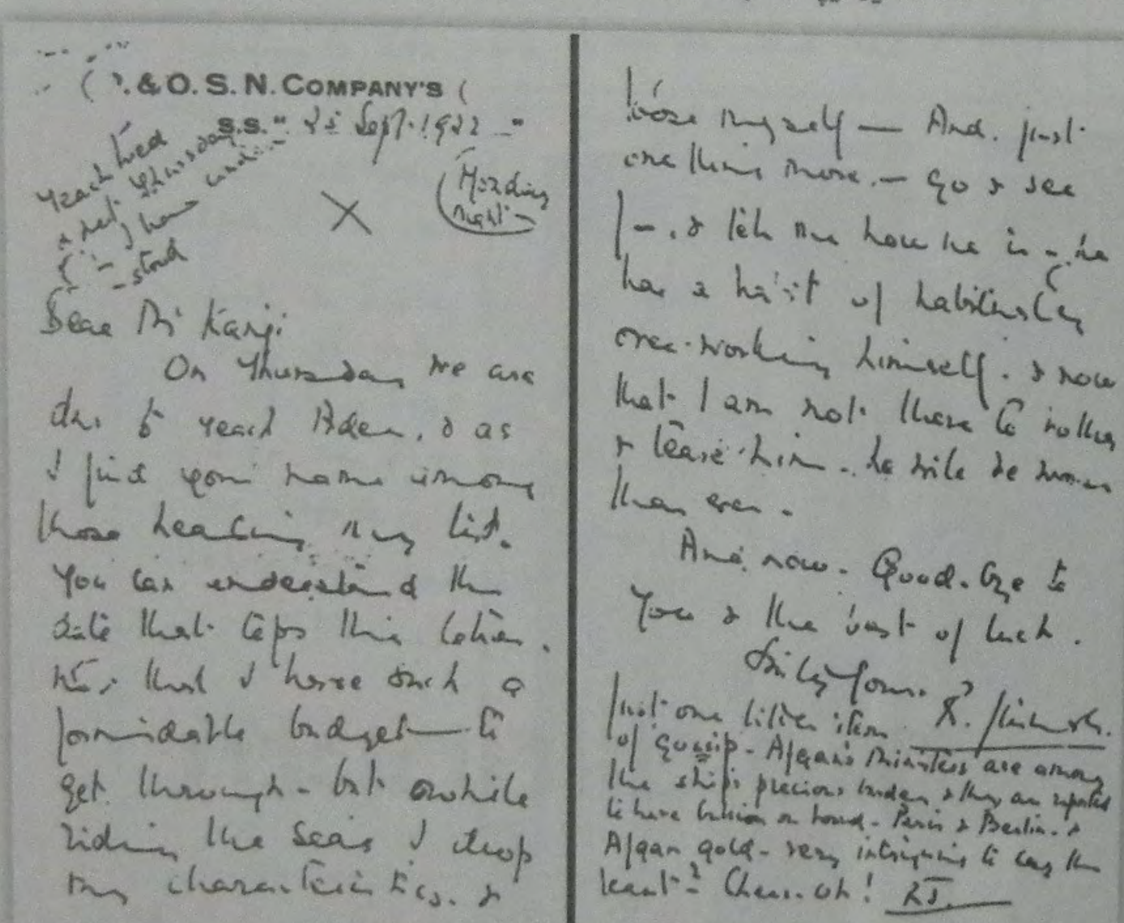
GANDHIJI

THROUGH MY DIARY LEAVES

Jamsher
With love
Kanji
23 May 1950

To R. J.

دائیں جانب اوپر کانجی دوآرکاداس کی کتاب "گاندھی جی تھرو مائی ڈائری لیفس" کا پہلا صفحہ جس پر کانجی کے
دستخط موجود ہیں، نیچے اس کتاب کا انتساب جو رتی جناح کے نام ہے، بائیں جانب اس کتاب کا سرورق



P. & O. S. N. COMPANY'S
S.S. " 25 Sept. 1922 "
Monday night

Reach Wed & sail Thursday ... I have ... stand

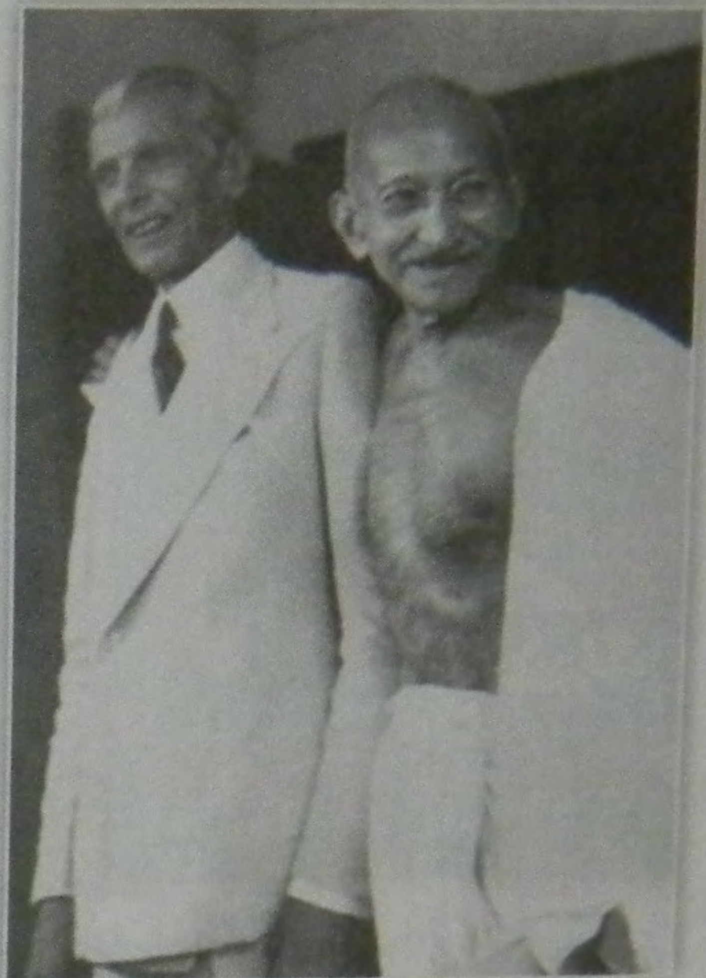
Dear Mr Kanji:
On Thursday we are due to reach Aden, & as I find your name among those heading my list. You can understand the state that keeps this letter. Not that I have such a formidable budget to get through - but awhile riding the seas I drop my characteristics & loose myself — And just one thing more. — go & see J. & tell me how he is - he has a habit of habitually over-working himself & now that I am not there to bother & tease him - he will do more than ever.

And now - Good-bye to you & the best of luck.

Sincerely Yours, R. Jinnah.

Just one little item of gossip - Afgan's Ministers are among the ship's precious burden & they are reputed to have billions on board - Paris & Berlin - & Afgan gold - very intriguing to say the least? Cheer-oh! R.J.

کانجی دوآرکاداس کے نام رتی جناح کے خط کا پہلا اور آخری صفحہ



قائداعظم اور مہاتما گاندھی



قائداعظم اور جواہر لال نہرو

S.S. Rajputana
Marseilles 5 Oct. 1928

Darling – Thank you for all you have done. If ever in my bearing you had sensed any irritability or unkindness – be assured that in my heart there was place only for a great tenderness and a greater pain – a pain my love without hurt. When one has been as near to the reality of Life – (which after all is Death) as I have been dearest, one only remembers the beautiful and tender moments and all the rest becomes a half veiled mist of unrealities. Try and remember me beloved as the flower you plucked and not the flower you tread upon.

I have suffered much sweetheart because I have loved much. The measure of my agony has been in accordance to the measure of my love.

Darling I love you – I love you – and had I loved you just a little less I might have remained with you – only after one has created a very beautiful blossom one does not drag it through the mire. The higher you set your ideal the lower it falls.

I have loved you my darling as it is given to few men to be loved. I only beseech you that the tragedy which commenced with love should also end with it.

– Darling Goodnight and Goodbye

Ruttie

rather write to you afresh from the [illegible] of my heart R.

I had written to you at Paris with the intention of posting the letter there. But I felt that I would

قائداعظم کے نام رتی جناح کے آخری خط کا عکس



ممبئی میں قائداعظم کے مکان ساؤتھ کورٹ کا بیرونی منظر



رتی جناح کی قبر کا ایک منظر

دوسرا واقعہ 17 اگست 1940ء کو بمبئی کے گورنمنٹ ہاؤس میں پیش آیا۔ 8 اگست کی تجاویز کے بعد جناح کو وائسرائے سے بمبئی میں ملنے کی دعوت دی گئی۔ اس سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے لارڈ لنلتھگو (وائسرائے) ایک ''وار ایڈوائزری کونسل'' تشکیل دے کر اس کا اعلان کر چکے تھے۔ اس کونسل میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں کا نام بھی شامل تھا۔ مسلم لیگ نے وار کونسل کا بائیکاٹ کرنا طے کیا تھا۔ اس کے باوجود سر سکندر حیات خاں (جو مسلم لیگ کے اہم رکن تھے) کونسل میں شریک ہو گئے۔ جناح کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے اخباروں میں یہ بیان دیا کہ لارڈ لنلتھگو کی یہ حرکت نہایت نامعقول ہے۔ اب ہوا یوں کہ وائسرائے سے ملاقات کا وقت گیارہ بجے دن مقرر تھا لیکن اس وقت تک جناح وہاں نہیں پہنچے۔ ہر شخص جناح کے مزاج سے واقف تھا کہ وہ وقت کے کتنے پابند تھے۔ ٹیلی فون پر ٹیلی فون آتے رہے۔ آخر سوا گیارہ بجے جناح گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ وائسرائے کو انتظار کی زحمت دینا خود جناح کے اخلاق سے بعید تھا۔ لیکن اس موقع پر جناح نے کوئی معذرت نہیں کی۔ ہاتھ ملانے کے بعد جب دونوں بیٹھے تو وائسرائے نے ان کے اخباری بیان کا ذکر کیا اور کہا کہ شاید جناح کو ان کے (وائسرائے کے) طریقہ کار سے کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی جسے وہ دور کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی جناح اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے ''جو کچھ ہوا اس کے لیے مجھے وائسرائے سے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے''۔ اتنا کہا اور وائسرائے کو ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ جو لوگ لنلتھگو کے دبدبے سے واقف ہیں وہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ ہمیں اس واقعے پر فخر ہوتا ہے کیونکہ سب دوسرے ہندوستانی لیڈر جن میں کانگریسی ہائی کمان کے لوگ بھی شامل تھے، اس برطانوی وائسرائے کے لیے ''شریف ترین انگریز'' اور ''شریف ترین کرسچین'' کی توصیفی صفتیں استعمال کر رہے تھے۔ کم از کم ایک ہندوستانی تو ایسا تھا جو حق گوئی اور بے باکی سے کام لے کر اس کے منہ پر کھری کھری سنا دینے کی جرأت رکھتا تھا۔

گاندھی جی کو بلانے کا الزام

جناح کے اخلاق کے سلسلے میں ایک یہ بھی شکایت کی جاتی ہے کہ اتنے مغرور تھے کہ خود گاندھی

جی کی قیام گاہ پر جانے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوئے بلکہ اس پر اصرار کرتے تھے کہ گاندھی جی ان کے یہاں آئیں۔ لیکن اس کا اصلی سبب خود جناح نے مجھے یہ بتایا تھا کہ جب کبھی گاندھی جی کے یہاں ملنے گئے تو گاندھی جی کا کوئی نہ کوئی سیکریٹری یا خادم ان دونوں کی بات چیت میں مخل ہو جاتا۔ بعض اوقات اس قسم کی مداخلت کا سبب نہایت مضحکہ خیز ہوتا۔ آرٹیکل پر نظر ثانی کرنی ہے، کچھ کاغذات کی تصحیح فوری طور پر ضروری ہے، ان کی کوئی بہو ساس کی بدسلوکی کی شکایت لے کر آئی ہے...... غرض ان حالات میں کوئی سنجیدہ گفتگو ممکن ہی نہیں تھی۔ جناح نے گاندھی جی سے شکایت بھی کی کہ اگر ان کے رفقا نہیں چاہتے کہ وہ ان سے راز داری کے ساتھ گفتگو کریں تو وہ (جناح) ان کے یہاں آنا چھوڑ دیں گے۔ جناح کی اس صاف گوئی اور شکایت کو گاندھی جی نے بھی تسلیم کیا تھا۔

خوش پوش جنٹلمین

جناح بڑے ٹیپ ٹاپ کے آدمی تھے۔ انہیں صحیح طور پر ''ہندوستان کے سیاسی لیڈروں میں سب سے زیادہ خوش پوش جنٹلمین'' کہا گیا ہے۔ ان کی اس خوش پوشی کی عادت میں ان کی بیوی، رتی کو کتنا داخل تھا، یہ کہنا مشکل ہے۔ 1943ء میں ''ڈیلی ہیرالڈ'' کے جنگی نمائندے کیپٹن ڈکٹر ٹامسن نے جناح کے بارے میں لکھا تھا:

> ''مسٹر جناح اپنے گھر ہی کی طرح نفاست کا نمونہ ہیں۔ ان کے چھریرے جسم پر بھورے رنگ کا سوٹ خوب جچتا ہے۔ ان کی ٹائی اور پاتابوں سے شوخ رنگ کے باوجود معصومیت ٹپکتی ہے۔ عقابی چہرے پر لگی ہوئی یک چشمی عینک، عمیق نگاہوں اور بھورے سوٹ میں تو وہ بالکل مشہور فلمی اداکار جارج آرلس کے چھوٹے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ برسوں کی وکالت کے تجربے نے ان کی گفتگو میں بڑی صفائی پیدا کر دی ہے''۔

گول میز کانفرنس کا اعلان

31 اکتوبر 1929ء کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ اروِن نے اعلان کیا کہ برطانوی

حکومت ہندوستان کو نو آبادیاتی درجہ دینے پر تیار ہے۔ یہ بھی اعلان ہوا کہ اس مقصد کی خاطر ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے گی جس میں دیسی ریاستوں، برطانوی حکومت اور ہندوستانی نمائندوں کو شریک کیا جائے گا۔ لارڈ اروِن کا یہ اعلان موتی لال نہرو کے مطالبے سے بہت قریب تھا اس لیے اس کا استقبال گرم جوشی سے کیا گیا۔ گاندھی جی اور سپرو نے مل کر ایک بیان مرتب کیا جس پر ان دونوں کے علاوہ جواہر لال نہرو، مدن موہن مالویہ، مسز بیسنٹ، ڈاکٹر انصاری، وٹھل بھائی پٹیل اور چودھری خلیق الزماں کے بھی دستخط تھے۔ اس بیان میں وائسرائے کے اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کانفرنس جلد از جلد بلانے اور اعلان کے بعض حصوں میں ترمیم کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔ دراصل جواہر لال نہرو کے دستخط کرانے میں گاندھی جی کا ہاتھ تھا۔ لیکن بعد میں جواہر لال نہرو نے اپنے دستخط واپس لے لیے۔ سوبھاش چندر بوس اور ان کے بائیں بازو کے بعض ساتھیوں نے علیحدہ بیان دیا جس میں وائسرائے کی پیش کش کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ برطانوی لیبر پارٹی کی اس تجویز پر انگلستان میں کنزرویٹو اور لبرل پارٹی نے سخت نکتہ چینی کی، جس کی بدولت ایک طرح سے ہندوستانی انتہا پسندوں کو تقویت پہنچی۔ اس نے کانگریس ورکنگ کمیٹی پر بھی اپنا اثر ڈالا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دہلی سے شائع کیے گئے بیان کو تعاون کا پروانہ ہرگز نہ سمجھا جائے۔ جناح اپنی جگہ ڈومینین حیثیت کی حکومت کے وعدے اور بقیہ تفصیلات گول میز کانفرنس کی ذریعے طے کیے جانے کی تجویز سے مطمئن تھے۔ جو اعتدال پسند تھے وہ دہلی کے بیان کی اس شرط کو پسند نہیں کرتے تھے کہ مطالبے پورے نہ ہونے کی صورت میں عدم تعاون کیا جائے۔ جناح اس بارے میں اعتدال پسندوں کے ہم خیال تھے۔ موتی لال نہرو بڑے فکر مند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ گول میز کانفرنس کی تجویز کو تباہ ہونے سے بچا لیا جائے۔ انہوں نے سپرو کو مشورہ دیا کہ کس طرح گاندھی جی اور وائسرائے کے درمیان بات چیت کا انتظام کریں۔ سپرو نے یہ کام یو۔ پی کے گورنر بٹلر کے ذریعے انجام دیا۔ وٹھل بھائی پٹیل نے بھی سپرو کی مدد کی۔ پٹیل ان دنوں سینٹرل اسمبلی کے صدر تھے اور وائسرائے سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ وائسرائے نے ملاقات کرنا منظور کر لیا لیکن اس شرط پر کہ موتی لال نہرو، سپرو، جناح اور وٹھل بھائی پٹیل کے ساتھ گاندھی جی

سے بات چیت ہو۔ گفتگو تین چار نکات ہی پر ہونے والی تھی: سیاسی قیدیوں کی رہائی، گول میز کانفرنس کے نمائندوں کا انتخاب۔ بعد میں یہ مسئلے برطانوی حکومت کی طرف سے بات چیت کے لیے منظور کر لیے گئے اور وائسرائے سے ملاقات کی تاریخ 13 دسمبر طے ہوگئی، لیکن موتی لال نہرو کو 12 دسمبر کو لکھنؤ میں ایک اہم مقدمے میں حاضر ہونا تھا اس لیے انہوں نے 13 کے بجائے 14 دسمبر تجویز کیا مگر اس دن وائسرائے بہادر شکار کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ آخر 23 تاریخ مقرر ہوئی مگر اس تبدیلی نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔

اتفاقات یا حادثات

وائسرائے کی کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے گاندھی جی وقت پر بمبئی پہنچ گئے تھے لیکن التوا کی خبر ملتے ہی وہ دس دن کے لیے واردھا چلے گئے۔ وہاں انہیں جواہر لال نہرو کے اس خطبہ صدارت کا مسودہ ملا جو لاہور میں منعقد ہونے والے اجلاس میں پڑھا جانے والا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ گاندھی جی مسودے کی ''اصلاح'' کردیں۔ اس خطبے میں جواہر لال نہرو نے واضح طور پر کانگریس کو مشورہ دیا تھا کہ گول میز کانفرنس کی دعوت مسترد کردی جائے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گاندھی جی، جواہر لال نہرو کے خطبے سے ضرور متاثر ہوئے۔ اب اتفاق یہ ہوا کہ 23 دسمبر کو جب وائسرائے میسور سے شکار کھیل کر واپس آرہے تھے تو ان کی گاڑی پر کسی نے بم پھینکا مگر خیریت ہوئی، کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ کانفرنس چار بجے سہ پہر کو شروع ہونے والی تھی۔ اس دن صبح سے گاندھی جی کا ہفتہ وار چپ کا روزہ شروع ہوگیا جو چار بجے ختم ہونے والا تھا۔ اس روزے کی وجہ سے سپرو، جناح اور وٹھل بائی پٹیل کو کوئی اندازہ نہیں ہوسکا کہ گاندھی جی کے خیالات میں کوئی تبدیلی بھی ہوئی ہوگی۔

کانفرنس میں کیا ہوا؟

کانفرنس رسمی تمہید سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد مطلب کی بات ہوئی۔ وائسرائے نے حاضرین سے پوچھا کہ ان کے ذہن میں کوئی بات دریافت طلب ہو تو بتائیں مثلاً سیاسی قیدیوں کی رہائی، گول میز کانفرنس کی دعوت کا اصول وغیرہ۔ یہ بات طے تھی کہ گول میز کانفرنس میں

کانگریس کے نمائندے سب سے زیادہ ہوں گے اور کانگریس ہی ان کا انتخاب کر کے وائسرائے کو نام بھیجے گی۔ قیدیوں کی رہائی بھی ایک طرح سے طے شدہ بات تھی۔ لیکن گاندھی جی نے اس موقع پر فرمایا کہ تفصیلات پر بحث کرنے سے قبل وہ ہندوستان کے عام سیاسی حالات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ اس جائزے کا آغاز انہوں نے 1757ء کی جنگ پلاسی کی داستان سے کیا اور یہ ثابت کرنے لگے کہ کس طرح برطانوی حکومت نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے اور فرمایا کہ وہ مجوزہ گول میز کانفرنس کے بارے میں اس وقت تک بحث کے لیے تیار نہیں ہوں گے جب تک لارڈ اروِن اس کانفرنس میں ڈومینین حیثیت کا پکا وعدہ نہ کر لیں۔ گاندھی جی ایک گھنٹے تک بولتے رہے۔ ان کی تقریر نہ صرف وائسرائے بلکہ سپرو، جناح اور وٹھل بھائی پٹیل پر بھی بم کے گولے کی طرح پڑی۔ موتی لال نہرو کو گاندھی جی نے پہلے سے اپنا ہمراز بنا لیا تھا۔ وائسرائے نے ہزار سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کانفرنس کا مقصد ڈومینین حکومت حاصل کرنے کے لیے میدان ہموار کرنا ہے اور وہ اس موقف میں ہرگز نہیں ہیں کہ فوراً برطانوی حکومت کی جانب سے ڈومینین حیثیت کی حکومت دے دینے کا اعلان کر سکیں۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا اور سمجھوتے کی یہ تمہیدی کانفرنس کچھ حاصل کیے بغیر ہی ختم ہوگئی۔ اس واقعے کے تین چار دن بعد سر تیج بہادر سپرو ایک کانفرنس کے سلسلے میں مدراس آئے۔ میں بھی تھیاسوفی کے ایک جلسے کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا۔ وہیں سی۔ پی۔ راما سوامی آئر کے مکان پر سپرو نے یہ ساری داستان سنائی۔ اس طرح پیہم اتفاقی حادثات کی وجہ سے ایک سنہرا موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ اگر گاندھی جی نے جواہر لال نہرو کا خطبہ نہ دیکھا ہوتا، اگر موتی لال کے مقدمے کی تاریخ 12 دسمبر نہ ہوتی، اگر وائسرائے نے شکار کو اہم ملکی معاملات پر ترجیح نہ دی ہوتی تو ہندوستان کی تاریخ آج کس قدر مختلف ہوتی! 1929ء کے اخیر میں جواہر لال نہرو کے زیر صدارت منعقد ہونے والے کانگریس کے لاہور اجلاس میں گاندھی جی کی پیش کی ہوئی ''مکمل آزادی'' کی تجویز منظور کر لی گئی اور گول میز کانفرنس میں حصہ نہ لینے کا بھی فیصلہ کر لیا۔

پہلی گول میز کانفرنس

سپرو اور جیکر کی ناکام کوششوں کے بعد 11 ستمبر 1930ء کو گول میز کانفرنس کے مندوبین

کے ناموں کا اعلان ہوگیا۔ 12 نومبر 1930ء کو لندن میں اس کانفرنس کا افتتاح ہز میجسٹی شاہ جارج پنجم کی مصالحتی تقریر سے ہوا۔ کانگریس کے سوا ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں اور مختلف مفادات کے نمائندوں نے شرکت کی۔ دیسی ریاستوں کے بھی کئی نمائندے شریک ہوئے۔ بیکانیر کے مہاراجا گنگا سنگھ اور نواب صاحب بھوپال نے دیسی ریاستوں کی طرف سے سمجھوتے اور تعاون کی جو پیش کش کی اس سے سیاسی دنیا ششدر رہ گئی۔ بیکانیر کے مہاراجا پکے قوم پرست تھے اور رجواڑوں میں بڑے ہی محنتی آدمی مانے جاتے تھے۔ نواب صاحب بھوپال جناح کے گہرے دوست تھے اور سرکاری حلقوں میں ''کانگریسی پرنس'' کہلاتے تھے۔ ان کے سیکریٹری برطانوی حکومت کے باغی، شعیب قریشی تھے، جو 1923ء میں گاندھی جی کے پیرو کی حیثیت سے قید بامشقت جھیل چکے تھے۔ دیسی ریاستوں کی طرف سے نواب صاحب بھوپال نے یہ اعلان کیا: ''ہم لوگ ہندوستان سے وفاق کے لیے، اسی صورت میں تیار ہوں گے جبکہ خود برٹش انڈیا کو خودمختار اور وفاق بنا دیا جائے''۔ اس طرح دیسی ریاستوں کا بنیادی مسئلہ تو طے ہوگیا لیکن ابھی ہندو مسلم مسئلہ باقی تھا، ایسے میں ڈاکٹر امبیدکر نے پسماندہ قوم کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ پیش کر کے اس میں مزید پیچیدگی پیدا کر دی۔

لندن میں کیا ہوا؟

ان حوصلہ شکن حالات کے تحت لندن میں کیا ہوا، اس کی تفصیلات میں سر چمن لال سیتل واد کی کتاب Recollection & Reflection سے پیش کرتا ہوں:

> ''کانفرنس میں ہندوستان کی لبرل پارٹی کی خاصی نمائندگی تھی۔ سب ملا کر 13 لبرل لیڈر تھے۔ گول میز کانفرنس شروع ہونے سے کافی دن پہلے ہم لندن پہنچ گئے تھے۔ طے پایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کچھ نمائندے آپس میں مل کر فرقہ وارانہ مسائل پر سمجھوتا کرلیں۔ سپرو، شاستری، جیکر، مونجے اور مجھے، آغا خان اور جناح سے ملنے کو کہا گیا۔ ہم نواب صاحب بھوپال کی قیام گاہ پر ملے اور کئی راتیں مسلسل ملتے رہے۔

ہمیں نواب صاحب کی موجودی سے بہت مدد ملی۔ وہ بڑے بے چین تھے کہ کسی طرح سمجھوتا ہو جائے۔ جب ہم پہلی بار ملے تو آغا خان سے میں نے پوچھا ''اگر ہم کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں تو کیا آپ مخلوط انتخاب کا طریقہ منظور کر لیں گے''۔ پھر میں نے دوسرا سوال کیا: ''اگر ہم لوگ مخلوط انتخاب اور سارے مسائل پر سمجھوتا کرنے پر رضامند ہو جائیں تو کیا مسلم مندوبین کانفرنس میں قومی مطالبے کی تائید کریں گے؟'' انہوں نے بچے تلے انداز میں جواب دیا: ''اس صورت میں تم رہنمائی کرو ہم تمہاری پیروی کریں گے''۔ اس کے بعد ہم نے ان سے پوچھا کہ سمجھوتے کے لیے ان کے مطالبات کیا کیا ہیں؟ انہوں نے یہ خاص مطالبے بتائے: ''سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے علیحدہ علیحدہ دو صوبے بنائے جائیں اور صوبائی اسمبلیوں کی نمائندگی میں مسلمانوں کو معقول نمائندگی حاصل ہو، مرکزی اسمبلی کی جملہ نشستوں کی ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کے لیے مخصوص ہوں''۔ اس وقت تک جو دیسی ریاستیں اپنے نمائندے مرکزی اسمبلی میں بھیجنے والی تھیں، ان کے وفاق کا سوال نہیں اٹھا تھا۔ سپرو، شاستری اور ہم ان مطالبات کو اسی وقت تسلیم کر کے مخلوط انتخابات کا اصول بھی منوا لیتے لیکن ہمیں جیکر اور مونجے کے رویے سے بے حد مایوسی ہوئی۔ پہلے ہم نے سندھ کے علیحدہ صوبہ بنانے کا سوال کیا۔ جیکر اور مونجے اس سلسلے میں بہت سی شرطیں لے آئے جن کا پورا ہونا، ان کے خیال میں ضروری تھا۔ صرف اسی ایک مسئلے پر بحث کرنے میں کئی شامیں گزر گئیں، دوسرے نکات پر بحث میں بھی کئی راتیں صرف ہوئیں۔ اس دوران میں ہندوستان کے بعض رجعت پسند مسلمانوں کے کانوں میں جو لندن میں مقیم تھے، ہماری کارروائیوں کی بھنک پڑ گئی۔ انہوں نے

مسلمان مندوبین پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ آخر ایک رات کو آغا خان نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب معاملہ ان کے قابو سے باہر ہے اور وہ مسلمان مندوبین کو کسی سمجھوتے کا پابند نہیں کر سکیں گے۔ اس طرح ایک اور سنہرا موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ اگر میرا، سپرو یا شاستری کا بس چلتا تو ہم آغا خان کے مطالبات منظور کر کے، مخلوط انتخابات کا اصول تسلیم کروا کے مسلم مندوبین سے دستخط حاصل کر لیتے، اور اگر ایسا ہوتا تو ہندوستان کی تاریخ آج کچھ اور ہی ہوتی"۔

جناح کا رویہ

کانفرنس کے دوران جناح نے دونوں جانب کے رجعت پسندوں کے خلاف اپنا رویہ کھلم کھلا ایک پکے قوم پرست کا رکھا۔ انہوں نے برطانوی کنزرویٹو پارٹی پر یہ کہہ کر بڑا سخت حملہ کیا کہ ہندوستان میں ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ان کے تجارتی مفاد محفوظ رہیں۔ اس بیان سے کنزرویٹو پارٹی کے ارکان بہت برہم ہوئے۔ انہوں نے آغا خان کے ذریعے جناح پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے مقام سے ذرا بھی نہیں ہٹے اور ہندوستانیوں کے مقاصد اور ان کے مفاد کے لیے ڈٹے رہے۔ برطانیہ کے وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ نے جناح کو بلا کر سمجھایا کہ حالات جس طرح پلٹے کھا رہے ہیں ان کے پیش نظر برطانوی وزیر اعظم کو ایسے ہندوستانیوں کی ضرورت ہوگی جو صوبوں کے گورنر بن سکیں گے۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اگر جناح نے "نیک چلنی" کا ثبوت دیا تو انہیں بھی گورنری کے عہدے سے سرفراز کیا جا سکتا تھا۔ جناح نے جواب میں ریمزے میکڈونلڈ سے پوچھا کہ کیا برطانوی تجارتی مفاد کو محفوظ کروانے کی خاطر انہیں رشوت دی جا رہی ہے؟

رشوت کے بعد دباؤ

آغا خان نے جناح پر پھر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ایک روز جب رات کے بارہ بج رہے تھے آغا جان نے جناح کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر وہ (جناح) برطانوی تجارتی مفاد کی مخالفت کرتے رہیں گے اور سپرو، شاستری اور سیتل واد کے ساتھ مل کر ہندو

مسلم سمجھوتے پر رضامند ہو جائیں گے تو یہ بات یقینی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کی مدد بھی حاصل نہ ہوگی۔

سر فضل حسین کا کارنامہ

ان دنوں ہندوستان میں سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ انہیں جب لندن میں ہندو مسلم سمجھوتے کی کوششوں کا علم ہوا تو بڑے سٹ پٹائے۔ وہ اپنی ڈائری میں 3 دسمبر 1930ء کو لکھتے ہیں:

> "گول میز کانفرنس کی خبروں سے پتا چلتا ہے کہ (برطانوی) لیبر حکومت نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ مسلمان کسی عنوان سے مخلوط انتخاب کا اصول تسلیم کر لیں۔ شفیع، نواب بھوپال، سلطان احمد، فضل حق اور ہدایت اللہ اس چال میں آ گئے ہیں۔ لیکن دوسرے اس کے مخالف ہیں۔ محمد علی جوہر بھی مدد کرنے کی کوشش میں اور بلاشبہ جناح پس پردہ اس کی حمایت میں لگے ہوئے ہیں۔ مجھے سخت اقدام کرنے پڑے تب جا کر معاملہ بال بال بچ سکا۔ ہم لوگوں کو بہرحال جداگانہ انتخابات کے ذریعے ہی بنگال اور پنجاب کے اکثریت کے صوبوں میں اور باقی چھ صوبوں اور مرکزی اسمبلی میں اپنا وزن قائم رکھنا چاہیے۔ ہندو چاہیں تو تعاون نہ کریں۔ اس کے بعد اگلے دس برس میں ہم کو اپنی طاقت کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے"۔

دوسری گول میز کانفرنس

19 جنوری 1931ء کو پہلی گول میز کانفرنس ختم ہو گئی اور مندوبین ہندوستان واپس چلے آئے۔ 25 جنوری کو چوٹی کے قومی رہنما قید سے رہا کر دیے گئے۔ 9 فروری کو موتی لال نہرو کا انتقال ہو گیا۔ گاندھی جی نے سپرو اور سیتل واد کی زبانی گول میز کانفرنس کی روداد سنی۔ اس کے بعد انہوں نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ گاندھی جی اور لارڈ اروِن کی آٹھ بار ملاقاتیں ہوئیں جس

کے بعد 14 مارچ کو ''گاندھی ارون پیکٹ'' تیار ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے سول نافرمانی کی تحریک روک دی گئی۔ سارے سیاسی قیدی چھوڑ دیے گئے۔ انسدادی قانون اور امتناعی حکم نامے واپس لے لیے گئے۔ کانگریس نے دوسری گول میز کانفرنس میں حصہ لینے کا بھی فیصلہ کیا۔ اس بار کانفرنس کے مندوبین میں گاندھی جی، سپرو، شاستری، سیتل واد، جیکر، امبید کر اور آغا خان بھی تھے۔ جناح لندن ہی میں تھے لیکن وہ بحث میں کوئی اہم حصہ نہ لے سکے کیونکہ وہ کانگریس کو کسی معقول سمجھوتے پر رضامند کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ مسلمانوں کی قیادت آغا خان جیسے رجعت پسندوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اس کانفرنس کے سب سے اہم مندوب گاندھی جی تھے جو تنہا کانگریس کی نمائندگی کر رہے تھے۔

گاندھی جی کی غلطی

سیتل واد نے اپنی کتاب میں اور شاستری نے دوسری گول میز کانفرنس کے متعلق اپنے خطوط میں جو کچھ لکھا ہے، انہیں پڑھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ وفاق (فیڈریشن) اور اقلیتوں...... بالخصوص، مسلمانوں اور اچھوتوں کے متعلق...... گاندھی جی نے کتنی بڑی سیاسی غلطی کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر گاندھی جی، پنڈت مالویہ، جیکر اور جی۔ ڈی۔ برلا جیسے فرقہ پرست ہندوؤں کے اثر میں نہ آئے ہوتے تو فرقہ وارانہ مسئلہ اور پست اقوام کا مسئلہ اس کانفرنس میں طے ہو جاتے۔

مخلوط انتخابات کب اور کیسے؟

اقلیت کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے سیتل واد نے یہ ایک اہم دوراندیشانہ نوٹ لکھا:

''جہاں تک جداگانہ اور مخلوط انتخابات کے جھگڑے کا تعلق ہے یہ بات ظاہر ہے کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان میں ان کا مفاد اور تحفظ مخلوط انتخابات کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اگر ایک بار مذہبی معاملات، تہذیب، پرسنل لاء، معاشرتی روایات، تعلیم، ملازمتوں میں معقول حصہ اور اسمبلی میں ان کی معقول نمائندگی کا تحفظ ہو جائے اور اس طرح مفاد کے ٹکراؤ اور مختلف فرقوں کے درمیان اختلاف کا انسداد کر دیا

جائے تو پھر یقیناً اقلیتی فرقوں کے لیے مناسب یہی ہوگا کہ وہ مخلوط انتخابات کو تسلیم کر لیں۔ جب تک اکثریت فرقے کے نمائندوں کے انتخاب کرنے میں مسلم ووٹروں کی مؤثر آواز نہ ہوگی اس وقت تک وہ اکثریت پر اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ یہ اصول بعض مشہور مسلم لیڈر مثلاً ہز ہائنس آغا خان، مسٹر جناح اور کئی دوسرے بھی مان چکے ہیں، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے اگر نشستیں بھی محفوظ کردی جائیں تو پھر ان کا تحفظ پوری طرح ہو جاتا ہے"۔

جناح کی مقبولیت

سیتل واد آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اس وقت جناح اس خیال سے مکمل اتفاق رکھتے تھے۔ عرصے تک وہ یہ محسوس کرتے رہے کہ اگر ان کے لیے آئینی طور پر یہ ممکن ہو جائے تو اسمبلی کے لیے وہ عام نشست سے انتخاب لڑیں گے۔ ان دنوں واقعی اگر عام نشست سے کھڑے ہو جاتے تو مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ بڑی اکثریت سے کامیاب ہو جاتے"۔

سیتل واد کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ میں بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سن بیس اور تیس کے درمیان جناح کسی بھی سیاسی پارٹی یا کسی بھی فرقے کے حریف کے مقابلے میں بھاری اکثریت سے جیت جاتے۔ وہ بمبئی کے اہم ترین اور مقبول ترین رہنما تھے۔

تیسری گول میز کانفرنس

27 جون 1932ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں سر سیموئل ہور، سیکریٹری آف اسٹیٹ نے حکومت کی طرف سے تیسری گول میز کانفرنس کا اعلان کیا۔ اس مرتبہ طریقہ کار اب تک کی برطانوی پالیسی سے جدا تھا۔ 16 جولائی کو بمبئی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کے اختتام پر سپرو، شاستری، جیکر، چنتامنی اور رنگاسوآمی آئنگر کے دستخطوں سے ایک بڑا سخت بیان شائع ہوا

جس میں برطانوی حکومت کی نئی پالیسی کی مذمت کی گئی تھی۔ بہر حال 17 نومبر 1932ء کو لندن میں تیسری گول میز کانفرنس شروع ہوئی۔ اس میں برطانوی لیبر پارٹی کے نمائندے شریک نہیں ہوئے۔ برٹش انڈیا کے نمائندوں کی تعداد بھی پہلی اور دوسری کانفرنس کے مقابلے میں کم تھی۔ شاستری، سیتل واد، جناح اور چنتامنی کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔

جناح لندن میں

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد یعنی دسمبر 1931ء ہی سے جناح لندن میں مقیم ہو گئے تھے۔ میں وہاں کئی باران سے ملا، ہیمپ اسٹیڈ میں ایک مکان خریدنے کے بعد وہ مستقل طور پر لندن میں رہ کر پریکٹس کر رہے تھے۔ کنگز بنچ واک میں ان کا چیمبر تھا۔ چونکہ انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستانی سیاست سے ایک حد تک لاتعلق کرلیا تھا۔ اس لیے برطانوی حکومت نے انہیں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہیں دی اور نہ انہیں مئی 1932ء میں جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے کاموں میں شریک کیا۔

علیحدگی کا سبب

پانچ سال بعد 1938ء میں تقریر کرتے ہوئے جناح نے خود عائد کردہ جلاوطنی کا سبب ان الفاظ میں بیان کیا:

> ''گول میز کانفرنس کے موقع پر مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا لگا۔ خطرے کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی مجھے ہندو جذبات، ہندو ذہنیت اور ہندو مزاج نے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اب اتحاد کی کوئی امید باقی نہیں ہے۔ میں اپنے ملک کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ صورت حال بے حد افسوس ناک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مسلمان بے وطن ہیں۔ انہیں یا تو برطانوی حکومت کے حکام ہنکاتے پھرتے تھے یا پھر کانگریس کے پٹھو بھی کام کرتے تھے۔ جب کبھی مسلمانوں کی تنظیم کی کوشش کی گئی، ایک طرف ٹوڈی اور دوسری طرف کانگریسی حلقے کے بعض غدار، ان کوششوں کو ناکام

کر دیتے تھے۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ نہ میں ہندوستان کی مدد کر پاتا ہوں نہ ہندو ذہنیت کو بدلنے کی سکت رکھتا ہوں اور نہ ہی مسلمانوں کو صورت حال کی نزاکت سمجھانے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ میں اس حد تک پژمردہ اور مایوس ہو گیا کہ لندن ہی میں سکونت اختیار کر لینے کا تہیہ کرلیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ہندوستان سے مجھے محبت نہیں تھی ...... میں اپنے آپ کو مجبور محض پاتا تھا"۔

میں جب جناح سے لندن میں ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہندوستان سے اٹھارہ مہینوں کی غیر حاضری کے دوران وہ ملک کے حالات سے بڑی حد تک بے خبر ہو چکے تھے۔ وہ لندن میں جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی کارروائیوں تک سے ناواقف تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس زمانے میں نہ تو وہ کسی ہندوستانی لیڈر سے ملنے گئے اور نہ کوئی ان سے ملنے آیا۔ ان کو اس کا علم نہیں تھا کہ مجوزہ دستور کی ہیئت کیا ہونے والی تھی۔ لیکن اس بے خبری کے باوجود انہیں یہ جاننے کا شوق تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ مجھ سے بے شمار گہرے گہرے سوالات کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس شخص کے دل سے نہ تو ہندوستان سے دلچسپی گئی ہے اور نہ اس کی محبت کم ہوئی ہے۔

جناح نے چائے بنائی

ایک روز جناح کے ساتھ لنچ کرنے کے بعد سہ پہر میں پھر ان کے چیمبر میں ملنے گیا۔ وہاں اس عظیم لیڈر، بانی پاکستان نے کیتلی میں میرے لیے اپنے ہاتھ سے پانی گرم کیا اور چائے بنائی۔ اس دن میں ان کے ساتھ تقریباً پانچ گھنٹے رہا۔

واپسی کیسے ہوئی؟

لندن میں بس جانے کے بعد بھی جناح کے دل میں ایک نہ ایک دن ہندوستان واپس آنے کی تمنا ہمیشہ مچلتی رہی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے لیے ان کے ذہن میں کوئی خاص نقشہ یا منصوبہ نہ تھا۔ انہوں نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ ان کا ہندوستان واپس آنا اس وقت تک بے سود ہے جب تک ان کی کھوئی ہوئی پوزیشن دوبارہ نہ مل جائے اور انہیں سیاسی قیادت حاصل نہ ہو جائے۔

یہ موقع لیاقت علی خان نے بہم پہنچایا۔ لیاقت علی خان، جو جناح کے گورنر جنرل بننے پر پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے، ان کے بڑے دوست اور رفیق کار رہے تھے۔ میرے یورپ پہنچنے کے کچھ دنوں ہی بعد وہ جناح سے ملے۔ سب سے پہلے لیاقت علی خان کی جناح سے ملاقات کلکتہ میں، آل انڈیا پارٹیز کانفرنس کے بعد، 1928ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں ہوئی تھی۔ اس موقع پر لیاقت علی خان نے جناح کے نقطہ نظر کی تائید کی تھی اور اس وقت سے وہ جناح کے دوست اور شریک کار بن گئے تھے۔ لندن کی ملاقات میں لیاقت علی نے جناح کو سمجھایا کہ اب ان کے ہندوستان کو مراجعت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ لیاقت علی خان نے انہیں بتایا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ایسے قائد کی ضرورت ہے جسے کسی قیمت پر خریدا نہ جا سکے۔ لیاقت علی اور مسز لیاقت علی، دونوں نے جناح کی بڑی منت سماجت کی کہ وہ مسلم لیگ کی قیادت قبول کر لیں۔

جناح راضی ہو گئے۔ دسمبر 1933ء میں مجھے جناح کا یہ خط ملا:

''ڈیئر کانجی۔

تمہارے خط مؤرخہ 27 نومبر کا شکریہ۔

میں 22 دسمبر 1933ء کو مارسیلز سے ''ملوجا'' نامی جہاز سے روانہ ہو رہا ہوں اور امید ہے کہ 4 جنوری 1924ء کو بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد تم سے اور دوسرے احباب سے مدت کے بعد دوبارہ ملنے کا اشتیاق رہے گا۔

محبت کے ساتھ

تمہارا مخلص

ایم اے جناح''

ناکامی کی ذمہ داری

لندن کے دوران قیام میں میری ملاقاتیں سر ارنسٹ ہوٹسن سے ہوتی رہیں۔ یہ میرے بمبئی کے دوست تھے۔ 1920ء کے لگ بھگ وہ بمبئی میں ہوم ممبر تھے اور کچھ دنوں کے لیے گورنر بھی

رہ چکے تھے۔ میں نے لندن میں ان سے پوچھا'' آپ کے خیال میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسئلے کا حل کیا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا:

''اگلی نسل'' پھر اپنے جواب کی خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولے:

''ہندوستان کی نئی نسل، ہندو اور مسلم، لڑکیاں اور لڑکے اب ایک ساتھ تعلیم پا رہے تھے۔ ان میں نہ فرقہ وارانہ اختلافات ہیں نہ ذات پات کے بھید بھاؤ۔ آگے بڑھ کر جب یہ سن شعور پر پہنچیں گے تو تعجب کریں گے کہ ان کے باپ دادا کیسے بے وقوف تھے کہ انہوں نے ذات پات اور دھرم کے جھگڑوں میں پھنس کر، اپنے ملک کو سوراج سے دور ہٹا کر، برطانیہ کو پھوٹ ڈالنے اور حکومت کرنے کا موقع دے رکھا تھا۔ ایک نسل کے بعد فرقہ وارانہ مسئلہ ختم ہو جائے گا''۔ اس بات کو تیس سال گزر چکے ہیں، ایک چھوڑ دو دو نسلیں سامنے آ چکیں مگر فرقہ وارانہ مسائل بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور ابھی تک ان کا کوئی حل نظر نہیں آتا ہے۔ 1933ء میں ایسا ضرور لگتا تھا کہ ہوٹسن کے اندازہ کے مطابق یہ مسئلہ ایک نسل کے بعد ہی طے ہو جائے گا۔ میں اور جناح، دونوں اس پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن میرا، ہوٹسن اور جناح کا یہ خواب اگر شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تو اس کی ذمہ داری مسلم لیگ سے کہیں زیادہ کانگریس پر عائد ہوتی ہے۔

جناح کی علالت

مارچ 1934ء کی ایک شام جناح نے مجھے فون کیا کہ اگلے دن ساڑھے دس بجے میں ان کے ہائی کورٹ چیمبر میں ملوں۔ چنانچہ میں وہاں وقت پر پہنچ گیا مگر جناح کا پتا نہ تھا...... یہ بڑی غیر معمولی بات تھی کیونکہ ہمیشہ وہ ٹھیک ساڑھے دس بجے ہائی کورٹ پہنچ جایا کرتے تھے۔ ان کے بنگلے پر فون کیا تو ملازم نے بتایا کہ وہ گزشتہ رات کو بہت بیمار ہو گئے تھے۔ پانچ دن جناح پر غشی رہی اور وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ جس روز انہیں ہوش آیا میں ان کے گھر پہنچا، انہوں

نے پاس بلایا۔ تیمارداروں کی ناگواری کے باوجود نصف گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ

جولائی 1935ء میں برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا۔ یہ دستور جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا نتیجہ تھا جو لارڈ لنلتھگو کی صدارت میں مقرر کی گئی تھی۔

سر سیموئیل ہور نے اس کمیٹی کے سامنے جو شہادت دی تھی اس کے سلسلے میں وہ اپنی کتاب Ten Troubled Years میں لکھتے ہیں:

> "پارلیمنٹ کے بتیس ارکان اور ستائیس ہندوستانی اسیسروں نے مجھ پر جو جرح کی اس کا سلسلہ انیس دن تک جاری رہا۔ میں نے اس دوران کوئی دس ہزار اصلی اور ضمنی سوالوں کے جواب دیے۔ گو ان سوالات کے دائرے میں صوبائی خودمختاری اور کل ہند وفاق کے متعلق ہر طرح کے سوالات پوچھے گئے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی برطانوی یا ہندوستان نے ہندوستان کی تقسیم کے امکان کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا۔ اس وقت تک پاکستان کی حیثیت ایک مسلم شاعر کے رومانی دماغ کے تصور سے زیادہ نہ تھی۔ لفظ "پاکستان" بھی تقریباً غیر معروف تھا"۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ جب پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اس پر بحث کے دوران ڈیڑھ کروڑ الفاظ بولے گئے جو پارلیمانی کوائف کے چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں لیکن اس میں کہیں بھی "پاکستان" کے امکانی وجود کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ردعمل

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ رجعت پسند اقدام تھا۔ اس کا مقصد برطانوی تجارتی مفاد کو مستحکم کرنا تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے میں مدد کے لیے کڑی دفعات کی پناہ موجود تھی۔ کسی ہندوستانی اسمبلی کو ایسے قانون پاس کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی جس سے ہندوستان میں کام کرنے والی برطانوی تجارتی فرم اور جہاز راں کمپنیوں کے ساتھ امتیازی سلوک برتے جانے کا امکان ہو۔

اپریل 1936ء میں جناح نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے بمبئی کے جلسوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کو ذمہ داری تو صرف دو فی صد دی گئی ہے لیکن گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی اور تحفظات کا حصہ 98 فی صدی رکھا گیا ہے۔ پھر وہ دو فی صدی ذمہ داری بھی دو وفاقی اسمبلیوں کے درمیان پھنس کر گم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد دستور کو بدلنے کی غرض سے برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے طریقے پر بولتے ہوئے جناح نے کہا کہ ملک میں فوجی انقلاب ناممکن سی بات ہے۔ عدم تعاون کا طریقہ آزمایا گیا اور ناکام رہا۔ اب صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ آئینی احتجاج جاری رکھ کر اسمبلیوں کے اندر اور ایوان سے باہر ایسی قوتوں کو ابھارا جائے جس سے گورنمنٹ جھکنے پر مجبور ہو جائے۔ لیکن یہ اسی حالت میں ممکن ہوگا جب کہ سب قومیں مل کر شانہ بشانہ کام کریں۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ کانگریس اپنے مقصد میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر نہ چلے۔ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے جناح نے کہا کہ کانگریس ان کے حقوق کو تسلیم نہ بھی کرے تب بھی اپنی قوم اور اپنے ملک کے مفاد کی خاطر انہیں اپنے آپ کو منظم کرنا چاہیے اور حصول آزادی کی راہ پر گامزن ہو کر منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ اس طریقہ کار میں کامیاب ہو گئے تو کانگریس خود ان کے پاس آنے پر مجبور ہوگی۔

لنلتھگو کی کوششیں

لارڈ ویلنگڈن کے بعد لارڈ لنلتھگو ہندوستان کے نئے وائسرائے مقرر ہوئے۔ ان کی حکومت اور خود وہ، اگر چاہتے تو دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کا تعاون حاصل کر کے فیڈریشن (وفاق) کا اصول منوا لیتے لیکن وہ ہر راجا اور نواب سے فرداً فرداً فیڈریشن کا اصول قبول کروانے لگے۔ دو سال گزر گئے، نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ موقع ہاتھ سے نکلتا گیا۔ تضیع اوقات کی ذمہ داری کانگریس پر بھی کچھ کم عائد نہیں ہوتی ہے۔ اگر جناح کا مشورہ قبول کر کے کانگریس اسمبلیوں کے اندر اور باہر آئینی جدوجہد رکھتی اور اگر کانگریس، جناح اور مسلم لیگ کا تعاون حاصل کر کے فیڈریشن کے مطالبے پر برابر زور دیتی تو صورت حال بالکل دوسری ہوتی، خصوصاً اس حالت میں جبکہ ہر پارٹی

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی مذمت پہلے ہی کر چکی تھی۔

1937ء کے انتخابات

ملک میں 1937ء کے اوائل میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ کانگریس نے اس سلسلے میں جو منشور شائع کیا اس میں دو باتیں متضاد تھیں۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا تھا کہ کانگریس کے ارکان اسمبلیوں میں جا کر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر عمل کرنے کے بجائے اس کو ختم کرنے کے لیے لڑتے رہیں گے۔ دوسری طرف اسی منشور میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کانگریسی ارکان، اسمبلی میں کون کون سے تعمیری کام کریں گے۔ کانگریس کو یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ صوبائی انتخابات میں اسے قطعی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ البتہ یہ امید تھی کہ انتخابات کے بعد وہ سب سے بڑی پارٹی ہوگی اور کسی دوسری کم تعداد کی پارٹی کے ساتھ مل کر اکثریت کی پارٹی بن سکے گی۔ اس امکان کے پیش نظر انتخابات سے قبل، کانگریس نے مسلم لیگ سے مفاہمت کر لی تھی۔ کوئی تحریری معاہدہ تو نہیں ہوا لیکن یوپی میں جواہر لال نہرو اور چوہدری خلیق الزماں کے درمیان یہ بات طے پا چکی تھی کہ غیر ملکی حکومت کی مخالفت میں دونوں مل کر کام کریں گے، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان یہ کوئی نئے قسم کا سمجھوتا نہیں تھا۔ اس سے پہلے 1920ء میں موتی لال نہرو اور جناح کے درمیان اور اس کے بعد 1940ء میں بھولا بھائی ڈیسائی اور لیاقت علی خان کے درمیان، اسمبلیوں میں اتحاد عمل کا پیمان ہو چکا تھا۔ انتخابات کے نتیجے نکلے تو پانچ صوبوں میں کانگریس کو قطعی اکثریت حاصل ہوگئی۔ چار صوبوں یعنی بمبئی، بنگال، آسام اور صوبہ سرحد میں کانگریس ہی سب سے بڑی واحد پارٹی ثابت ہوئی۔ بمبئی میں کانگریس کے ممبروں کی تعداد بقیہ دوسرے ممبروں کے مقابلے میں ایک کم تھی۔ پنجاب اور سندھ میں کانگریس اقلیت میں رہی۔ مسلم لیگ نے بھی خاصی کامیابی حاصل کی۔

وزارت کی دعوت

مارچ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ دہلی میں ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ کانگریس اس شرط پر وزارتیں قبول کرے گی کہ صوبائی گورنر یقین دلائیں کہ وہ اپنے اختیارات خصوصی سے کام نہیں لیں

گے۔ بمبئی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر بی۔ جی۔ کھیر چنے گئے۔ لارڈ بریبورن نے، جو گورنر تھے کھیر کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ لیکن چونکہ گورنر، کانگریس کی شرط ماننے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر لارڈ بریبورن نے دوسری پارٹی یعنی مسلم لیگ کے لیڈر سر علی محمد دہلوی کو وزارت بنانے کو کہا مگر جیسا کہ خود جناح نے مجھے بتایا، ان کی ہدایت کے ماتحت علی محمد دہلوی نے یہ کہہ کر معذرت پیش کر دی کہ جمہوری نظام حکومت میں اقلیت وزارت قائم کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ لیکن جیسے ہی علی محمد دہلوی اپنے گھر پہنچے، بریبورن نے انہیں دوبارہ فون کیا کہ وہ سیاسی پارٹی کی حیثیت سے نہ سہی اپنی انفرادی حیثیت میں عبوری حکومت میں شریک ہو جائیں۔ جناح کو اس کا علم ہوا تو لارڈ بریبورن کی اس غیر آئینی حرکت پر بہت برہم ہوئے اور انہیں سخت احتجاجی خط لکھا جس میں سیاسی جماعتوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ بہر حال بریبورن نے ایک عبوری حکومت بنا ڈالی جو صرف تین مہینے قائم رہی۔ اس دوران تعطل دور کرنے کی غرض سے کانگریس سے گفت و شنید کا سلسلہ پس پردہ جاری رہا۔ وائسرائے نے یقین دلایا کہ ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ گورنمنٹ اور وزارتوں میں ہم آہنگی قائم رہے اور ایسی صورت پیدا نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے وزارتوں کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔ اس طرح کانگریس کے مطالبے منظور ہونے کے باوجود صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کا اعلان 7 جولائی 1937ء کو کر دیا گیا۔

کھیر اور مسلم وزیر

بمبئی میں کھیر وزیر اعلیٰ چنے گئے۔ انہوں نے جناح سے اپنی وزارت میں شامل کرنے کے لیے دو مسلم لیگی ارکان کے نام مانگے۔ جناح اس کے لیے بخوشی رضامند ہو گئے اور کانگریسی وزارت کو مسلم لیگ کے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا اس کی داستان خود بی۔ جی۔ کھیر نے مجھے سنائی اور جس کی تصدیق بعد میں جناح نے کی۔ قصہ یہ ہوا کہ کانگریس ہائی کمان اس کے لیے کسی طرح رضامند نہ تھا کہ جناح سے کسی قسم کا تعلق پیدا کیا جائے۔ چنانچہ کھیر کی یہ خواہش رد کر دی گئی اور اس کی بدلی ہوئی شکل یوں پیش کی گئی کہ مسلم لیگ کے جن دو ارکان کو لیا جائے گا وہ پہلے لیگ سے مستعفی ہوں اور کانگریس میں شریک ہو جائیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں

کہ یہ شرط لیگ کے لیے انتہائی ہتک آمیز تھی۔ جناح بجا طور پر اس سے خفا ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے کانگریس کی تجویز ٹھکرا دی۔ وہ کانگریسی وزارت سے تعاون ضرور کرنا چاہتے تھے لیکن اپنی پارٹی کا گلا نہیں گھونٹنا چاہتے تھے۔

نہرو کی غلطی

بمبئی سے ملتی جلتی غلطی یو پی میں نہرو نے کی۔ کانگریس کی غیر متوقع کامیابی سے وہ پھولے نہیں سمائے اور اسی ترنگ میں خلیق الزماں سے کیا ہوا وہ وعدہ بھلا بیٹھے جس کے تحت انہوں نے کانگریسی وزارت میں مسلم لیگ کے دو ارکان لینا منظور کیا تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ الیکشن میں کانگریس کے رفیع احمد قدوائی کی کامیابی خلیق الزماں کی مدد کی رہین منت تھی۔

"یوم نجات"

ان واقعات نے جناح کو بے حد ناراض اور خفا کر دیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ کانگریس ان کا تعاون صرف ان کی توہین کر کے ہی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ 1939ء میں کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے دستور کی دفعہ 93 کے تحت صوبوں کا سارا نظم ونسق گورنروں کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ صورت حال جناح کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ کانگریس کے اس فیصلہ "خودکشی" پر انہوں نے 22 دسمبر 1939ء کو "یوم نجات" منانے کا اعلان کیا۔ اب جنگ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان چھڑ گئی۔ مگر اس زمانے میں بھی ان دونوں کے اختلافات کی خلیج کو کم کرنے کی کوشش ہوتی رہی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کانگریس وزارتیں نہ چھوڑتی اور جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ مصالحت کی کوشش کرتی تو فرقہ وارانہ امن قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتی تھی اور اس طرح برطانوی حکومت کو ڈومینین حیثیت کی حکومت کا مطالبہ پورا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔

ہندوؤں پر عدم اعتماد

میں 19 دسمبر 1938ء کو جناح سے ملا۔ میں سیاسی حالات کے بارے میں ان کا انداز فکر

معلوم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے گفتگو کا آغاز براہ راست اس سوال سے کیا: ''موجودہ سیاسی حالات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' ان کا جواب سن کر میں سکتے میں آ گیا۔ وہ میری طرف خشونت سے دیکھتے ہوئے بولے: تم مجھ سے اس طرح کا سوال کیوں پوچھتے ہو؟ اگر برطانیہ کا وزیر اعظم اپنے کمرے میں بیٹھا ہو تو کیا کوئی فرانسیسی یا جرمن ردی سیدھا ان کے کمرے میں گھس کر اس طرح کا سوال کرنے کی جسارت کرے گا؟ اور بالفرض ایسا ہو بھی تو کیا تم سمجھتے ہو کہ برطانوی وزیر اعظم ایسے سوال کا کوئی جواب دے گا؟'' میں نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس وقت نہ تو میں کوئی لیڈر تھا نہ ہندوؤں کا نمائندہ اور نہ ایک ہندو کی حیثیت سے بات کرنے آیا تھا۔ میری ملاقات اور گفتگو کی بنیاد تو ہماری بائیس سال کی دوستی تھی۔ اور پھر اس مسئلے پر اگر میں ان سے تبادلہ خیال کرنا چاہتا بھی تھا تو اس میں حرج ہی کیا تھا؟ اس پر جناح نے کہا کہ سیاسی معاملات کے بارے میں وہ کسی ہندو سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں سر پرشوتم داس سے بات کریں لیکن انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا کیونکہ ان کے خیال میں سر پرشوتم داس ہندوؤں کو متاثر نہیں کر سکتے تھے۔ مزید سوالات کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہندو قوم پر نہ تو جواہر لال نہرو کا اثر ہے نہ سوبھاش بوس کا، البتہ گاندھی جی کا اثر ضرور ہے، ولبھ بھائی پٹیل کا بھی اثر ہے۔ مگر منفی کیونکہ وہ نقصان تو کر سکتے ہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتے ہیں اور نہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس دن میں نے محسوس کیا کہ جناح میں پہلی سی بات نہیں رہی۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے دل میں اس قدر تلخی پیدا نہ ہونے دیں کیونکہ اس کا حاصل کچھ نہ ہوگا۔ ان کی گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کانگریس نے ان کو بری طرح جھنجھوڑ دیا ہے اور وہ اس بدسلوکی کو نہ تو بھلانے کے لیے تیار تھے اور نہ معاف کرنے پر آمادہ۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ جناح جیسا شخص بے حد دکھی اور بیزار ہو گیا تھا۔

''ہندوستان چھوڑ دو''

واقعات تیزی سے بدلتے گئے۔ مارچ 1940ء میں مسلم لیگ نے مطالبہ پاکستان پیش کر دیا۔ 14 جولائی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تجویز منظور کی۔ اس تجویز

کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ دینے کے بعد ملک کی اہم سیاسی جماعتیں مل کر ایک دستور ساز اسمبلی بنائیں گی۔ اس طرح گویا ایک حد سے مسلمانوں کے مطالبے کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں گاندھی جی یا جواہر لال نہرو نے جناح سے رابطہ قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہی تجویز 8 اگست 1942ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس میں منظور ہوئی جس کے دوسرے ہی دن سارے کانگریسی لیڈر جیل بھیج دیے گئے۔

کانگریس سے شکایت

28 اگست 1942ء کو جناح سے میری 90 منٹ تک ملاقات رہی۔ میں نے ان سے شکایت کی کہ بالفرض ان کے خیال کے مطابق کانگریس غلطی پر تھی پھر بھی ان کی ضد اور لڑنے کا انداز میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ جناح کے مجھ جیسے دوست ان سے کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کی توقع رکھتے تھے۔ اس کے جواب میں جناح نے الٹی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس جب بھی ان سے بات چیت کرنا چاہتی ہے تو گاندھی جی کے مشورے سے کسی غیر اہم شخصیت کو بھیجنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ جناح کا کہنا تھا کہ دراصل کانگریس کی ذہنیت ہی سراپا غلط تھی۔ وہ صورت حال کی حقیقتوں کو سمجھ نہیں رہی تھی، اس لیے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے مشترکہ فریق مقابل، یعنی برطانیہ کو ہندوستان پر اپنا اقتدار جمائے رکھنے کا موقع ملتا جا رہا تھا۔ جناح نے بڑی شد و مد کے ساتھ کہا کہ حصول آزادی کی تمنا میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ ملک میں برطانوی راج جاری رکھنے کی ذمہ داری کانگریس پر ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ کانگریس کے موجودہ رویے سے یا تو برطانوی اقتدار کی مدت بڑھتی جائے گی یا ان کی جگہ جاپانی لے لیں گے۔

راجا جی

جناح نے مجھے بتایا کہ تقریباً تین مہینے ہوئے راجا گوپال اچاریہ ان سے دلّی میں ملے تھے۔ راجا جی کے بارے میں جناح کا خیال تھا کہ کانگریس میں وہ ایک بہترین فرد ہیں، ذہین ہیں، صلاحیت، لیاقت اور خدمات کا ریکارڈ رکھتے ہیں، وہ سمجھوتے کے لیے بے حد کوشاں ہیں۔ لیکن کانگریس نے انہیں کیا دیا؟ وہ (جناح) خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے: "انہیں پارٹی سے

نکال باہر کیا!'' راجاجی بہت پرامید ہو کر گاندھی جی سے ملنے وار دھا گئے تھے۔ انہیں بھروسا تھا کہ گاندھی جی، جناح کی باتیں مان لیں گے لیکن گاندھی جی نے انکار کر دیا۔

پاکستان کا تصور

جناح نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ان کے پاکستان کا مقصد ''پان اسلام ازم'' ہرگز نہیں ہے۔ وہ پاکستان کو ہندوستان کے جغرافیائی حدود کے اندر دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ امور خارجہ کے معاملے میں ہندوستان اور پاکستان مل جل کر کام کیا کریں۔ انہوں نے یہ دلچسپ بات بھی بتائی کہ صوبہ بمبئی میں مقیم ہونے کی وجہ سے خود ان کی حیثیت اقلیت کے ایک رکن کی ہوگی، حکومت کے نظم و نسق میں انہیں کوئی مقام حاصل نہ ہوگا سوائے اس کے کہ ان کے تجربے، علم اور تدبر سے استفادہ کی غرض سے انہیں حکومت میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے ...... حقیقت میں جناح نہ تو پاکستان جانا چاہتے تھے نہ وہاں مستقل سکونت اختیار کرنا چاہتے تھے اور نہ آزاد مملکت پاکستان کے سربراہ بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ انہیں پاکستان کے وجود میں آنے کا گمان بھی نہیں تھا۔

مایوسی اور اضمحلال

اس گفتگو کے دوران میں مجھے ایسا لگا کہ جناح مضمحل، رنجیدہ اور اپنے آپ کو بڑی حد تک تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ مجھے ان کی صاف گوئی پسند آئی۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا کہ انہوں نے بمبئی میں انگریزوں کے غیر سرکاری طبقے میں سے کبھی کسی سے ملاقات کی؟ جناح نے جواب میں بتایا کہ سرکاری یا غیر سرکاری انگریزوں میں سے نہ تو کوئی ان سے ملنے آیا اور نہ وہ ان میں سے کسی سے رابطہ قائم کر سکے۔

میں نے اور سوالات کیے کیونکہ میں مجوزہ پاکستان کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ اس پر انہوں نے بڑی حسرت سے جواب دیا:

''مائی ڈیئر کانجی، میں کانگریس کی طرف سے ایک اشارہ چاہتا تھا۔ صرف ایک دوستانہ اشارہ! لیکن مجھے وہ بھی حاصل نہ ہوا۔ اگر یہ اشارہ مل جاتا تو ہمارے مسائل کا حل ہو جاتا کوئی دشوار بات

نہ تھی"۔ میرا خیال ہے کہ جناح اپنے آپ کو کمزور اور متزلزل محسوس کرنے لگے تھے...... اس لیے معقول اور مناسب شرطوں پر وہ کانگریس سے سمجھوتا کرنے پر نظر آتے تھے۔ مگر دقت یہ تھی کہ کانگریسی رہنما جیل میں تھے۔ چنانچہ اگلے تین برس تک کوئی ایسا موزوں شخص سامنے نہ آیا جو جناح اور کانگریس کے درمیان گفتگو شروع کروا سکتا۔ اس عرصے میں جناح نے اپنی طاقت کو مضبوط کرنے پر توجہ دی۔

راجاجی اور گاندھی جی

9 فروری 1943ء سے گاندھی جی نے آغا خان پیلس میں 21 دنوں کا برت شروع کیا جس کا مقصد انہوں نے تزکیہ نفس بتایا۔ برت کے خاتمے پر راجاجی ان سے ملے اور جو فارمولا انہوں نے پیش کیا اسے گاندھی جی نے قبول کر لیا۔

24 اپریل 1943ء کو نئی دہلی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ خطبہ صدارت میں جناح نے کہا کہ اگر گاندھی جی واقعی اب مسلم لیگ سے سمجھوتا کرنے پر رضامند ہیں تو وہ بھی اس کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کریں گے۔ انہوں نے گاندھی جی کو یہ بھی مشورہ دیا کہ جس طرح وہ (گاندھی جی) وائسرائے سے خط کتابت کر رہے تھے اسی طرح ان کو (جناح کو) بھی وہ اپنی تجویزیں لکھ بھیجیں۔ اس مشورے کی تعمیل میں گاندھی جی نے حکومت کو لکھا کہ وہ ان کے خطوط جناح کو بھی بھیج دیں۔ حکومت نے اس بات کی اطلاع تو جناح کو دے دی لیکن خطوط نہیں بھیجے۔

کل ہند قیادت

جناح جب دلّی سے لوٹے تو میں ان سے ملنے گیا۔ اس موقع پر میں نے کہا کہ میرے خیال میں کانگریس کا رویہ قطعی طور پر منفی ہو چکا ہے، جس سے ملک کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے، اس طرح آزادی نہیں ملے گی۔ کیوں نہیں وہ صرف مسلمانوں کو قیادت کی بجائے کل ہند پیمانے پر سب فرقوں کی قیادت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں؟ میں نے انہیں یاد دلایا کہ ہوم رول لیگ کے زمانے میں اور اس سے قبل بھی فی الواقع وہ کل ہند سطح کے لیڈر رہ چکے ہیں اور آج بھی ہندو مسلمان اور دوسرے فرقوں کی غیر کانگریسی جماعتوں کو وہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے وہ جناح کی قیادت حاصل کرنے کے لیے ان کی طرف آس لگائے بیٹھے ہیں۔ جناح نے کہا کہ انہوں نے بھی ہندوؤں کے رویے میں خوش گوار تبدیلی محسوس کی ہے، پھر وہ بولے کہ راجاجی، جی۔ ڈی۔ برلا، سری رام اور سر پرشوتم داس ٹھاکر داس ان سے دہلی میں ملے اور طے پایا کہ سب مل کر کام کریں گے۔ دوسرے روز جب میں سر پرشوتم داس اور جی۔ ڈی۔ برلا سے علیحدہ علیحدہ ملا تو دونوں کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ میں ان کی اور جناح کی ملاقات سے واقف تھا۔ ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ جو باتیں ہوئیں وہ ایسی نہیں تھیں جنہیں ضبط تحریر میں لایا جا سکے۔ اس وقت جبکہ گاندھی جی اور کانگریسی لیڈر جیل میں بند تھے اور ان کے ساتھ معاملے کی بات بھی نہیں کی جا سکتی تھی، ان تجویزوں کو کوئی عملی شکل دینا ممکن نہ تھا۔

اقتصادی بہبودی

14 جنوری 1944ء جمعہ کا دن تھا۔ جناح سے میری پون گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ اس موقع پر میں نے ہندوستان کی معاشی ترقی کے مسئلے پر ٹاٹا پلان کا ذکر کیا۔ اس کے علاوہ سر وشوے سریا پلان اور ڈاکٹر جان متھائی کی تجویز کا بھی ذکر آ گیا۔ پھر میں نے ان تقریروں کا بھی ذکر چھیڑا جو جناح نے کراچی اور دوسرے مقامات پر کی تھیں، جن میں جناح نے بار بار کہا تھا کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی خاطر وہ ایک پروگرام تیار کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض سے ایک کمیٹی آف ایکشن کے تقرر کا مسئلہ بھی ان کے زیر غور ہے۔ میں نے انہیں سر ایم۔ وشوے سریا کے دو پمفلٹ دیے جن میں صنعت کو فروغ دینے کی تجویزیں تھیں۔ میں نے جناح کو سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ سارے ملک میں صنعتی ترقی ہو تاکہ سب صوبوں کے مسلمانوں کو اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کا موقع ملے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ملک کو ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم نہ کیا جائے۔ اس وقت تک جناح ان اسکیموں سے واقف نہ تھے۔ انہوں نے میرے تجزیے سے اتفاق کیا اور مجھے وہ سارا لٹریچر بھیج دینے کو کہا جن کا ذکر گفتگو میں آیا۔ میں نے انہیں جے۔ آر۔ ڈی۔ ٹاٹا سے ملنے کا مشورہ دیا جو انہوں نے قبول کر لیا۔

جناح کا قصور کیا تھا؟

اس روز کی گفتگو سے میری وضاحت کے بغیر وہ میرا مطلب سمجھ گئے۔ پھر میں نے ان سے وہ سوال کیا جو مطالبہ پاکستان کے معاملے میں بار بار کیا جاتا تھا۔ اگر پاکستان بن گیا تو دفاع یا بیرونی حملے کی صورت میں اس کی خارجہ پالیسی کیا ہوگی؟ اس مرتبہ بھی ان کا جواب وہی تھا جو وہ پہلے دے چکے تھے۔ پھر بڑے درد بھرے انداز میں جناح نے مجھ سے پوچھا: ''مائی ڈیئر کانجی، یہ تو بتاؤ آخر جناح کا قصور کیا ہے، جس کی سزا میں اس کے خلاف اتنا زہر اگلا جا رہا ہے اور غلط بیانیوں سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں؟ ہندو پریس کیوں میرا دشمن ہو گیا ہے؟ تمہارے ہندو دوست کیوں میری نیت پر حملے کر رہے ہیں؟ کیوں وہ مجھے غدار بتا رہے ہیں؟ وہ میرے پچھلے کارناموں کا ریکارڈ کیوں فراموش کر رہے ہیں؟ وہ مجھے اتنا احمق کیوں سمجھ رہے ہیں کہ میں برطانوی حکومت کے ہاتھوں میں کھیل کر اس برصغیر کو آزادی سے دور دھکیل رہا ہوں؟ میں نے کیا مانگا؟ میرے مطالبے میں کون سی غیر معقول بات ہے؟ میں نے پاکستان مانگا لیکن یاد رکھو، میں تو پاکستان کا صرف اصول تسلیم کرانا چاہتا ہوں۔ میں نے کون سی برائی کی؟ کیا ہندو کانگریس اور ہندو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اگر وہ اور ہم ایک دوسرے سے تعاون کریں تو اپنے مشترکہ دشمن کو اپنے ملک سے باہر نکال سکتے ہیں؟ اگر ایک بار باہمی تعاون کے اصول پر اتفاق کر کے ہم انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر دوسری تفصیلات بھی آپس میں طے کر لیتے!''

گاندھی جی کی رہائی کی کوشش

اس کے بعد جناح نے تفصیل کے ساتھ اس خط کا ذکر کیا جو گاندھی جی نے ان کو پچھلے سال لکھا تھا۔ پھر انہوں نے مسلم لیگ کے 1943ء کے اجلاس کے خطبہ صدارت سے بعض اقتباسات پڑھ کر سنائے اور کہا: ''ہاں یہ درست ہے کہ میں گاندھی جی کی طرف سے ایک تحریر چاہتا تھا، یہ بات میں نے اپنے خطبے میں بھی کہی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ گاندھی جی کی قید سے رہائی کی کوشش کرتا۔ اگر وہ مجھے ایک تفصیلی خط اس طرح کا لکھ دیتے جس کے اشارے میں نے اپنے خطبے میں کیے تھے تو اس بنیاد پر مجھے ان کی رہائی کے لیے احتجاج کرنے کا موقع مل جاتا لیکن اس

کے بجائے گاندھی جی نے میری دیانت دارانہ اور مخلصانہ پیش کش سے غلط فائدہ اٹھانا چاہا مگر میں ان کے جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہ تھا''۔

جناح نے مجھے بتایا کہ 1924ء میں گاندھی جی کی جیل سے رہائی میں ان کی کوششوں کو کتنا دخل تھا۔ یہاں لقمہ دیتے ہوئے میں نے کہا''اور ستمبر 1917ء میں مسز بیسنٹ کی نظر بندی سے رہائی بھی آپ ہی کی کوششوں کی رہین منت تھی''۔ اس پر وہ بولے''لیکن مسز بیسنٹ تو میری لیڈر تھی، میں ان کا صرف ایک سپاہی تھا۔ سپاہی کی حیثیت سے یہ میرا فرض تھا کہ انہیں دوبارہ اپنے ساتھیوں کے درمیان لا کر ان کی قیادت میں اپنا کام جاری رکھتا...... وہ بڑی عظیم لیڈر تھیں! ان کے ساتھ کام کرنے میں خوشی بھی ہوتی تھی اور فخر بھی۔ ان دنوں ہم کیسے مل جل کر کام کیا کرتے تھے!''

اس کے بعد جناح نے 1936ء کی اس بات چیت کا ذکر کیا جو بھولا بھائی ڈیسائی، ستیا مورتی اور گوبند ولبھ پنت کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ سب مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ارکان تھے۔ جناح نے بتایا کہ اس گفتگو میں یہ طے پایا تھا کہ گرچہ'' کمیونل ایوارڈ'' کو وہ سب ناپسند کرتے ہیں لیکن اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ سب کسی ایسے متفقہ سمجھوتے کے لیے کوشاں تھے، جو نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے حق میں منصفانہ ہو بلکہ جس کی وجہ سے آگے چل کر ان دو بڑے فرقوں میں مل کر کام کرنے کی صورت پیدا ہو سکے۔ بھولا بھائی، ستیا مورتی اور پنت نے یہ مسئلہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے توثیق کے لیے پیش کیا لیکن گاندھی جی اور نہرو نے اس طرح کی باتیں سننے تک سے انکار کر دیا۔

راجا جی، جناح کی نظر میں

جناح نے مجھ سے کہا کہ وہ راجا جی کو ایک شریف، مخلص، ایمان دار اور خوش اسلوب آدمی سمجھتے ہیں۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ کاش راجا جی جرأت رندانہ سے کام لے کر گاندھی جی کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو سکتے تھے۔ جناح کے الفاظ یہ تھے:

> ''راجا جی بڑے پیارے آدمی ہیں، میں انہیں بے حد پسند کرتا ہوں...... مجھے ان پر افسوس بھی ہوتا ہے''۔

ان کا خیال تھا کہ گاندھی جی کے مقابلے میں نہرو سے گفتگو کرنا نسبتاً زیادہ آسان تھا۔

طبقاتی کشمکش

اس کے بعد میں نے جناح سے اس کشمکش کا ذکر کیا جو ان کی ذاتی مخاصمت کی بنیاد پر شروع ہو رہی تھی...... مسلم لیگ میں زمینداروں، کسانوں اور بے روزگار نوجوانوں میں خاصا اختلاف شروع ہو چکا تھا۔ میں نے خاص طور پر پنجاب اور کراچی کا ذکر کیا تو انہوں نے جواب دیا:

> ''تم مجھے سالہا سال سے جانتے ہو، کیا میں نے مفاد پرستوں کی کبھی پروا کی ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان زمینداروں کی مجھے ذرہ برابر بھی پروا ہے؟ سن لو، مسلم لیگ میں کوئی کشمکش نہیں ہے۔ مسلمان نوجوان طبقہ مجھ سے ہرگز بغاوت نہیں کرے گا۔ یہ سب باتیں ایک طرح کی خوش اندیشی پر مبنی ہیں۔ اس طرح کی افواہیں پھیلا کر ہمارے دشمن ہمیں کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے اور تو کچھ نہیں، ان کا مسخرہ پن ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں فضول ہیں''۔

لیڈروں کی کم ہمتی

پھر جناح نے مجھے بتایا کہ وہ کئی نامور ہندوؤں کی زبان سے سنتے رہے ہیں کہ کانگریس سراسر غلطی پر تھی لیکن سب کے سامنے یہی بات کھل کر کہنے کی ہمت ان میں نہیں تھی۔ جناح نے کہا:

> ''اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ جیل سے باہر بہت سے کانگریسی لیڈر موجود ہیں، جو اس معاملے کو آگے بڑھا کر مسلم لیگ سے سمجھوتا کر سکتے ہیں، صرف ہمت کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی کی تھوڑی سی مخالفت کرنے کی ہمت!''

جناح کے نام خط

اگست 1944ء میں گاندھی، جناح بات چیت ہونے والی تھی، لیکن جناح کی علالت کے

سبب ملتوی ہوگئی۔ اس سلسلے میں 16 اگست کو میں نے جناح کو لکھا تھا:

''گاندھی جی اور آپ کی ملاقات کے موقع پر، ہندو مسلم اتحاد اور ملک کو آزادی سے قریب لانے کی عظیم مشن کی کامیابی کے لیے آپ کی خدمت میں اپنی نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں۔ گزشتہ جنوری کی گفتگو مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے اپنے دوستوں سے بھی کہا کہ جہاں تک آپ کا تعلق ہے آپ کسی بھی باعزت سمجھوتے کی راہ میں ہرگز رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ مجھے خوب یاد ہے، آپ نے کہا تھا کہ ہندوؤں کی طرف سے آپ کوئی اشارہ چاہتے ہیں، جس کے بعد باتیں آسان ہوجائیں گی۔ تفصیلات پر بعد میں بحث ہوسکتی ہے۔ اب وہ اشارہ گاندھی جی کی طرف سے مل رہا ہے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ مالویہ، شاستری اور بعض دوسرے لیڈروں کی مخالفت اور فری پریس جرنل کے حمایتی، کانگریسی سوشلسٹوں کے سخت احتجاج کے باوجود گاندھی جی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے۔ اس کا بھی پورا امکان ہے کہ آپ انہیں اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوجائیں۔ اس موقع پر کسی طرح ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ جب میں آپ کے بارے میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ وطن پرستی اور حریت پسندی کے جذبے میں آپ بڑے سے بڑے کانگریسی لیڈر کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں ہیں تو میں کوئی نئی بات نہیں کہتا ہوں۔ جیسا کہ آپ خود مجھ سے کہہ چکے ہیں، برطانوی حکومت موجودہ ہندو مسلم کشمکش سے پوری طرح فائدہ اٹھا رہی ہے، وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی ہے کہ ان دو بڑے فرقوں میں کوئی سیاسی اتفاق ہو۔ اصلی نکتہ یہ ہے کہ جنگ کے اختتام سے پہلے ہی حکومت پر پورا پورا دباؤ ڈالنا چاہیے ورنہ انگلستان کو بعد میں ہماری نااتفاقی اور کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا پھر سے موقع ملے

گا۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں"۔

میں آپ کی توجہ ایک اور بات کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ کچھ دن ہوئے میں نے "ہندو" میں آپ کی سوانح حیات پر ایک تبصرہ پڑھا۔ اس میں اس بات کا اشارہ تھا کہ رتی کے ساتھ شادی کے موقع پر آپ کو سسرال سے تیس لاکھ روپے ملے تھے، حالانکہ یہ ایک لغو اور سراسر بے بنیاد بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ "ہندو" اور تبصرہ نگار کے نام ایک تردیدی بیان دے دیں تو مناسب ہوگا"۔

گاندھی جناح ملاقات

ستمبر کے آخری ہفتے اور اکتوبر کے دو ہفتوں میں گاندھی، جناح ملاقات ہوئی۔ بعد میں ان دونوں کی خط کتابت بھی شائع ہوئی۔ جس کے مطالعے سے صاف پتا چلتا ہے کہ پہلے دن کی گفتگو میں ہی ظاہر ہو گیا تھا کہ ان دونوں میں سمجھوتے کا کوئی امکان نہ تھا۔ پھر بھی بلا وجہ اور بلا ضرورت ملک کو تین ہفتوں تک امید و بیم کی کیفیت میں رکھا گیا اور جب نتیجے کا اعلان ہوا تو چاروں طرف مایوسی اور افسردگی کی فضا چھا گئی۔ میں اس ناکامی پر جناح کا ردعمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ 17 اکتوبر 1944ء کو میں نے ان سے ملاقات کی اور اپنی عادت کے مطابق اس دن کی گفتگو گھر آ کر نوٹ کر لی۔ میں نے جناح سے دریافت کیا کہ آئندہ وہ کون سا قدم اٹھائیں گے؟ برطانوی حکومت کے مقابلے میں ان کا رویہ کیا ہوگا؟ جناح جب بولنے لگے تو میں نے ان میں ایک نئی چیز پائی۔ وہ باتیں کرتے کرتے نچلے ہونٹ کر دباتے رہے، ان کے ہونٹوں میں ارتعاش تھا۔ یہ علامتیں تھیں ان کی اعصابی بے چینی اور احساس تنہائی کی۔ میں ان سے ڈھائی فٹ کے فاصلے پر بیٹھا تھا پھر بھی ان کی آواز سننے اور سمجھنے کے لیے کانوں کو معمول سے زیادہ متوجہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ اتنا آہستہ بول رہے تھے کہ لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنے آپ ہی سے بول رہے ہوں۔ بولتے وقت وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے بلکہ ان کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں کہیں دور ٹکٹکی لگائے تھیں۔ بات چیت کی ناکامی سے جناح کو جو رنج پہنچا تھا اس کے تکدر اور تکلیف کے آثار ان کے چہرے سے

عیاں تھے۔ وہ تھوڑے ہی دن پہلے انفلوئنزا سے اچھے ہوئے تھے۔ دیکھنے میں صحت مند لگتے تھے لیکن بہت کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ کافی دبلے بھی ہو گئے تھے۔ دوران گفتگو میں بار بار دخل دیتا رہا لیکن اس کا انھوں نے برا نہ مانا۔ بیچ بیچ میں جو سوالات میں کر رہا تھا، ان کے الفاظ کے انتخاب میں کافی احتیاط برت رہا تھا تاکہ انہیں یہ گمان نہ گزرے کہ میں جرح کر رہا ہوں۔ میں ان کے جذبات کو کسی طرح ٹھیس لگانا نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں ان دنوں میں بھی ان چند مخصوص لوگوں میں تھا جو جناح سے مساوی سطح پر بالکل دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ دوسرے احباب یا تو انہیں رنج پہنچا کر یا پھر ان سے خفا ہو کر دور ہٹ چکے تھے۔ جناح بہت ہلکی اور نحیف آواز میں بولے "گاندھی کیوں آئے تھے؟ جب وہ مجھے دینے کے لیے کچھ ساتھ نہیں لائے تھے تو پھر میرے پاس کیوں آئے؟" ان کی آواز سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ سوال اپنے آپ سے پوچھ رہے ہوں۔ انھوں نے یہ سوال کوئی دس بار سے کم نہیں دہرایا۔

میں نے ان سے پوچھا "کیا آپ کے خیال میں گاندھی جی کوئی شاطرانہ چال چلنا چاہتے تھے؟ کیا آپ کو وہ ایسی پوزیشن میں ڈال دینا چاہتے تھے کہ جہاں رائے عامہ آپ کے خلاف ہو جاتی؟" جناح نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا: "نہیں، نہیں، ہرگز نہیں۔ میں یہ بات ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی نے بڑی صاف صاف بات کی۔ اس بارے میں مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے"۔

ناکامی کے بعد

میں نے جناح سے پوچھا "اب کیا ہوگا؟" جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا کہ برطانوی حکومت، بات چیت کی ناکامی سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گی، اس پر خوش ہوگی، بیرونی ممالک میں ہندوستان کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائے گی اور اس طرح اپنی استبدادی حکومت جمائے رکھے گی۔ جناح نے جواب دیا "میں تم سے اتفاق کرتا ہوں، لیکن تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ چونکہ برطانوی حکومت صورت حال سے فائدہ اٹھانے والی ہے، اس لیے میں خودکشی کر لوں؟ یاد رکھو میں خودکشی کے مقابلے میں لڑتے ہوئے جان دینا

زیادہ پسند کروں گا"۔

میں نے انہیں نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ خودکشی کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بات صرف معاملے کو سلجھانے کی ہے۔ میری رائے ہے کہ جنگ کے خاتمے پر برطانیہ کی پوزیشن بین الاقوامی دنیا میں کمزور پڑ جائے گی، اور ہندوستان پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ میرے پوچھنے پر کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ وہ بولے "سمجھاؤ، سمجھاؤ" میں نے کہا "کیسے سمجھایا جائے؟" انہوں نے جواب دیا "کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی رائے آپ کی موافقت میں ہو جائے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا مع امریکا، آپ کے مطالبہ پاکستان کو برحق تسلیم کر لے؟" جناح نے جواب دیا کہ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ امریکا کیا چاہتا ہے۔ ان کی خواہش صرف اتنی ہے کہ ہندو اور برطانیہ ان کے مطمح نظر کو پوری طرح سمجھ لیں۔

مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس مسئلے کا تسلی بخش حل نکلے گا۔ اس بارے میں جناح سے میں نے پوچھا تو وہ بولے "مجھے تم سے اتفاق ضرور ہے لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ وقت کتنی تیزی سے نکلا جا رہا ہے؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس درمیان میں تلخی کتنی بڑھ رہی ہے؟ اگر سمجھوتا جلد نہ ہوا تو پھر ایک ساتھ کام کرنے کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوستی ختم ہو جائے گی اور تلخی باقی رہ جائے گی۔ امریکا کا حال دیکھو۔ آج بھی امریکا کے لوگ انگریزوں کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور ان میں تنقید، نکتہ چینی اور ایک دوسرے کی عیب جوئی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس کا سبب صرف اتنا ہے کہ برطانیہ نے امریکیوں کا مطالبہ آزادی وقت پر تسلیم نہیں کیا تھا۔ امریکنوں کو لڑ کر آزادی حاصل کرنا پڑی اس لیے اتنی مدت گزر جانے پر بھی آج تک امریکی انگریزوں کو اچھا نہیں سمجھتے"۔

نیا بنگلہ

5 نومبر 1945ء کو دیوالی تھی۔ میں وقت مقرر کیے بغیر اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر جناح کے یہاں دیوالی مبارک کہنے کے لیے پہنچ گیا۔ انہوں نے اپنے نئے نئے بنے ہوئے بنگلے کی پہلی منزل پر بلا لیا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر واقعی وہ پاکستان چاہتے تھے اور اس کے حصول کا انہیں یقین تھا تو پرانے مکان کی از سر نو تعمیر پر کئی لاکھ روپے خرچ کرنے کے کیا معنی تھے؟ مارچ

1934ء میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس پرانے مکان کو فروخت کرنا چاہتے تھے لیکن جتنی قیمت وہ چاہتے تھے اتنی نہیں ملی اس لیے انہوں نے خیال ترک کر دیا۔ اس کے بعد پھر اتنی بڑی رقم کا خرچ کرنا کیا اس بات کا اشارہ نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے وجود میں آ جانے پر یقین کامل نہیں رکھتے تھے؟ نومبر 1945ء تک بھی جناح کا اس بنگلے کو چھوڑ کر کراچی میں جا بسنے کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔

کانگریس سے شکایت

اسی دن جناح سے ایک اور دلچسپ بات ہوئی۔ موتی لال سیتل واد نے (جو حال تک ہندوستان کے کے اٹارنی جنرل تھے) کانگریس نے چاہا کہ وہ لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے بمبئی کی دو نشستوں میں سے ایک کے لیے امیدوار ہو جائیں۔ سیتل واد پہلے تو رضامند ہو گئے لیکن جب کانگریس نے ان سے اپنے عہد نامے پر دستخط لینے چاہے تو انہوں نے منظور نہیں کیا۔ میں نے اس کا ذکر جناح کے سامنے کیا تو وہ بولے "کتنا اچھا ہوا اگر وہ بھی اسمبلی کے ممبر ہو جاتے، مجھے ان کے ساتھ کام کرنے میں بڑی خوشی ہوتی"۔ ان الفاظ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں وہ پاکستان کے مطالبے پر بہت زیادہ مصر نہ تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے شکایت کی کہ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات میں کانگریس لاکھوں روپے ایسے مسلمانوں پر خرچ کر رہی ہے جو اپنے آپ کو "نیشنلسٹ مسلمان" کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ ایسے نہیں ہیں۔ انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا کہ کانگریس ایک بھی نیشنلسٹ مسلمان کو کامیاب نہیں کرا سکے گی، ہر نشست پر مسلم لیگ کا قبضہ ہو جائے گا۔ جناح کو اس کی بھی شکایت تھی کہ جواہر لال نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل اپنی تقریروں میں ان کو برا بھلا کہتے ہیں۔ آگے چل کر انتخابات کے نتائج سے پتا چلا کہ جناح کی قیادت اور مسلم لیگ کا اقتدار ناقابل تردید حقیقت تھی۔ وہ بلاشبہ مسلمانوں کے نمائندے تھے اور کانگریس ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

یادداشت میں جناح کا ذکر

ڈیوڈ گراہم پول کے کہنے پر میں نے 28 نومبر 1945ء کو برطانوی لیبر پارٹی کے لیے 53

سنگھوں کی ایک یاد داشت مرتب کی تھی جس کا عنوان تھا ''ہندوستان، اپریل 1944ء تا 1945ء۔آگے کیا؟''اس کے آخری حصے میں، میں نے جناح کے بارے میں یہ لکھا تھا:

''5نومبر کو میں جناح سے ملا۔پچھلے چھ سال کے مقابلے میں اس بار میں نے انہیں تندرستی کے لحاظ سے اور مزاج کے لحاظ سے بھی بہتر پایا۔ اکتوبر 1944ء میں وہ چڑچڑے اور تنگ مزاج ہو گئے تھے۔ ان کی طبیعت گری گری سی تھی اور وہ بیمار معلوم ہوتے تھے۔اس مرتبہ وہ ہشاش بشاش نظر آئے۔ کانگریس نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ناروا تھا۔ جولائی میں برطانوی حکومت نے اپنے فیصلے انہی پر چھوڑ دیے تھے جس کی وجہ سے وہ اپنے رویے میں اور زیادہ سخت ہو گئے تھے''۔

یادداشت کا آخری حصہ یہ تھا:

''خاتمہ کلام کے طور پر میں لیبر حکومت سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انہیں عملی قدم ابھی اور فوراً اٹھانا چاہیے۔اگر چار پانچ مہینے اور نکل گئے تو پانی سر سے گزر جائے گا''۔

امریکا کی دعوت

24مارچ 1946ء کو کیبنٹ مشن ہندوستان آیا اور بہت جلد مختلف لیڈروں سے بات چیت میں مصروف ہو گیا۔انہی دنوں مجھے امریکا سے ایک دعوت موصول ہوئی جس کی وجہ سے مجھے اس ملک میں مزدوروں کے مسائل کے مطالعے کا موقع ملا۔ سفر کی تیاری اور بعض سرکاری کارروائیوں کے لیے میں دہلی آ گیا۔ 18 اپریل کو صبح چھ بجے سردار پٹیل کے بنگلے پر ان سے رخصت ہونے کے لیے گیا۔وہ میرے سفر کے بارے میں سن کر خوش ہوئے۔وزارتی مشن کے ارکان ان دنوں شملہ میں تھے۔پٹیل نے مجھے بتایا کہ شملے سے واپسی پر مشن، کانگریس اور مسلم لیگ سے ایک عبوری قومی حکومت بنانے کو کہا جائے گا اور کانگریس اس بات پر رضامند ہو جائے گی۔اگر جناح نے اس میں شریک ہونا منظور نہ کیا تب بھی کانگریس حکومت بنالے گی۔ میں نے

پٹیل سے پوچھا کہ وہ کن شرائط پر جناح سے سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں؟ میرے سوال کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح پٹیل سے ملاقات کا وقت مقرر کیے بغیر، میں ان کے یہاں چلا گیا تھا اسی طرح جناح کے یہاں بھی پہنچ جاؤں گا اور ان کو پٹیل کی شرائط سے آگاہ کر دوں گا۔ پٹیل نے جواب میں کہا: ''اب جناح کے ساتھ کسی سمجھوتے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جناح سے کہہ دینا کہ کانگریس اور برطانیہ کے درمیان معاملہ طے پا چکا ہے۔ اب ہندوستان میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں رہا''۔ گو بات مذاق میں کہی گئی لیکن اس سے سردار پٹیل کے سوچنے کا ڈھنگ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ایک بار جب برطانیہ سے بات طے ہو چکی تو پھر جناح اور مسلم لیگ کے تعاون کی ضرورت ہی کیا تھی!

امریکا کا سفر

میں 30 مئی 1946ء کو بحری راستے سے امریکا روانہ ہو گیا۔ 42 دنوں کے تکلیف دہ سفر کے بعد 12 جولائی کو بوسٹن پہنچا۔ وہاں سے دوسرے مقامات پر گیا اور بے شمار لوگوں سے ملا۔ ڈیڑھ مہینے کے خوش گوار اور دلچسپ تجربے حاصل کر کے یکم ستمبر کو واشنگٹن آیا۔ دوسرے دن میں نے پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے نام، ہندوستان کی زمام حکومت ہاتھ میں لینے پر مبارک باد کے خطوط لکھے۔

10 ستمبر کو سردار پٹیل کا یہ جواب آیا:

> ''تمہارا واشنگٹن سے 2 ستمبر کا لکھا ہوا خط ملا۔ کافی تاخیر کے بعد آخر ہم نے حکومت کی ذمہ داری سنبھال لی ہے لیکن اب تک مسلم لیگ کو ہم ساتھ نہیں لا سکے۔ اس منزل پر مسٹر جناح کا رویہ بڑا افسوس ناک ہے۔ اگر وہ دست تعاون بڑھا دیتے تو سارے ہندوستان کے لیے یہ دن، یوم جشن ہو جاتا، اس کے بجائے انہوں نے رکاوٹیں ڈالنا پسند کیا ہے......''

لندن میں جناح سے ملاقات

امریکا سے روانہ ہو کر 6 ستمبر (1) کو میں لندن اس وقت پہنچا جب وزیر اعظم اٹلی نے لارڈ

---

(1) درست تاریخ ہے 6 دسمبر 1946ء (ع ع ج)

ویول، پنڈت نہرو، جناح، لیاقت علی خان اور بلدیو سنگھ کو ہندوستان کی سیاسی گتھی سلجھانے کے لیے وہاں بلایا تھا۔اس کی اس کانفرنس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں پندرہ دن لندن میں رہا۔اس دوران جناح سے میری بیس منٹ کی ملاقات بھی رہی۔ میں نے انہیں پژمردہ، کمزور اور بیمار پایا۔انہوں نے مجھ سے امریکا کے سفر کی تفصیلات پوچھیں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ میں سات مہینوں سے ہندوستان سے باہر رہا اس لیے مجھے پوری طرح علم نہیں ہے کہ میرے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔اس پر وہ بولے''ملک' کیسا ملک اور کہاں کا ملک؟ ہمارے یہاں کوئی ملک نہیں ہے، صرف ہندو ہیں اور مسلمان ہیں''۔

میں نے محسوس کیا اب جناح، پاکستان کے سوا اور کسی بنیاد پر سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، وہ اپنی جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے۔کانگریسی لیڈروں نے ان کی بری طرح توہین کی تھی۔ جناح نے بہار کے فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کیا اور کہا کہ کافی چھان بین کے بعد جو اعداد و شمار ملے ان کے حساب سے مقتولین کی تعداد تیس ہزار کے قریب پہنچتی ہے۔ یہ اعداد و شمار مبالغہ آمیز تھے۔ نہرو نے اسمبلی میں دو ہزار کا اعتراف کیا تھا۔

مسلم لیگ کا مطالبہ

چونکہ مسلم لیگ نے مجوزہ دستور ساز اسمبلی کا مقاطعہ کیا تھا اس لیے دلبھ بھائی پٹیل نے ایک تقریر میں اس بات کا مطالبہ کیا کہ اصولاً مسلم لیگ کو عبوری حکومت سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ عبوری حکومت کے روزمرہ معمولات میں مسلم لیگ تعاون سے گریز کر رہی تھی۔ میں نے جناح سے پوچھا کیا یہ مناسب نہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی اور ملک کے دستور کے بارے میں مسلم لیگ چاہے جو رویہ چاہتی، اختیار کرتی لیکن حکومت کے کاروبار اور ملکی بھلائی کی کوششوں میں ان جھگڑوں سے دور رہتی؟ جناح نے جواب میں کہا: ''کیا مطلب؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ اس کمرے میں بیٹھ کر ہم اور تم ایک دوسرے سے پیار کی باتیں کریں اور باہر ایک دوسرے کے چھرے گھونپیں؟''ان کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ نہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کے ارکان، عبوری حکومت میں تعاون نہ کریں بلکہ یہ بھی کہ کانگریسی ارکان کے کاموں

میں رکاوٹ ڈالیں۔

تلخی کا سبب

جب تک میں ان سے باتیں کرتا رہا، جناح کا رویہ دوستانہ رہا۔ انہوں نے بمبئی میں مجھے ملنے کو کہا اور یہ بھی یقین دلایا کہ میں جب چاہوں ان سے مل سکتا ہوں۔۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ اگر کانگریسی لیڈروں نے ان سے ذاتی تعلقات منقطع نہ کیے ہوتے تو ان میں اس حد تک تلخی نہ آئی ہوتی۔ ان کے وقار اور ان کی شخصیت کو بہت صدمہ پہنچا تھا جس سے نہ صرف ان کے جذبات مجروح ہوئے تھے بلکہ یہی ان کی تلخی کا سبب بھی تھا۔ وہ اپنے اطراف عدم اعتماد اور شک وشبے کا جال بچھا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ان کی فراست بدستور قائم تھی۔ وہ کم سخن اور اپنے مخالفوں کو زیر کرنے کا پورا ہنر جانتے تھے۔ نہرو جیسا نخوت پسند اور جذباتی آدمی بڑی آسانی سے اس کا شکار ہو جاتا تھا۔ نہرو کی ایک کمزوری (جس سے جناح بھی واقف تھے) ان کا لمبی تقریریں کرنے کا شوق تھا، جن میں وہ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جن سے فائدہ کے بجائے الٹا نقصان ہوتا تھا۔

اٹلی سے ملاقات

17 دسمبر کو وزیراعظم اٹلی سے میری پندرہ منٹ ملاقات رہی۔ اٹلی نے کہا کہ کانگریس کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ کسی طرح جناح اور مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہو جائیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں جناح سے مل چکا ہوں اور میں نے ان کا رویہ غیر واجبی پایا۔ میں نے اٹلی کو بتایا کہ ہندوستان کے لیڈر نہرو نہیں بلکہ پٹیل ہیں۔ اٹلی نے کہا وہ بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر کہ ہندوستان میں سردار پٹیل سے ملاقات کرنے پر میں ان سے کیا کہوں؟ اٹلی نے جواب دیا ''پٹیل سے کہو کہ وہ طاقت ور بھی ہیں اور بڑے بھی ہیں۔ انہیں چاہیے کہ جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ تھوڑی سی فیاضی برتیں اور انہیں دستور ساز اسمبلی میں لے آئیں''۔

میں نے پوچھا کہ فرض کر لیجیے کہ پٹیل دستور ساز اسمبلی میں جناح کو شریک کرانے میں کامیاب ہو گئے تو کیا ان کے خیال میں جناح کا رویہ معقول ہوگا؟ اور کیا وہ تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ اٹلی نے جواب دیا کہ ایک بار جناح نے دستور ساز اسمبلی میں شرکت کر لی تو پھر ان سے نمٹنا

آسان ہو جائے گا۔

ولبھ بھائی کا اعتراف

میں 25 دسمبر کو کراچی ہوتا ہوا بمبئی واپس آیا۔ 31 دسمبر کو احمد آباد میں پٹیل سے ایک طویل ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر انہوں نے اعتراف کیا کہ ایٹلی نے سمجھوتے کا جو مشورہ دیا تھا اسے قبول نہ کر کے کانگریس نے بڑی سخت غلطی کی ہے۔

3 مارچ 1947ء کو میں نے پٹیل کو ایک خط لکھا جس میں اس گفتگو کا حوالہ تھا اور اس کے ساتھ ایک ایسے نوٹ کا بھی ذکر تھا جو میں نے لندن میں اپنے مذاکرات پر تیار کر کے بی۔ جی۔ کھیر کی معرفت انہیں بھیجا تھا۔ میں نے اس خط میں یہ بھی دریافت کیا تھا کہ میرے لیے جناح سے ملنا مناسب ہو گا یا نہیں۔ ملک کے سیاسی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے، دوسرے ہی دن مجھے ولبھ بھائی کا یہ جواب ملا:

> ''مجھے تمہارا خط مؤرخہ 3 مارچ آج ملا۔ بالا صاحب کھیر نے تمہاری لندن کی بات چیت کے نوٹ دیے تھے۔ بلاشبہ لیبر حکومت نے ہمارے لیے اور دنیا کے سامنے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کے بیان سے (جو 20 فروری 1947ء کو شائع ہوا تھا) سر دست یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے پنجاب نکل گیا لیکن مجھے پھر بھی تمہاری طرح قطعی مایوسی نہیں ہے۔ مسلم لیگ وہاں وزارت بنانے میں کامیاب ہو بھی گئی تو سال سوا سال سے زیادہ نہیں چلا سکے گی۔ اگلے جون سے قبل یقینی طور پر دستور تیار ہو جائے گا۔ اگر لیگ نے پاکستان پر اصرار کیا تو پھر یہ ایک ہی صورت رہ جائے گی کہ پنجاب اور بنگال کا بھی بٹوارا کیا جائے۔ وہ لوگ خانہ جنگی کے بغیر تو پورا پنجاب اور پورا بنگال ہرگز نہیں لے سکیں گے۔ میں نہیں سمجھتا برطانوی حکومت تقسیم پر رضامند ہو گی، وہ سب سے زیادہ طاقتور پارٹی کو زمام حکومت سپرد کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور اگر اس نے یہ بھی نہ کیا تو

تقسیم کا مطالبہ تسلیم کرانے میں وہ کسی اقلیت کی مدد نہیں کرے گی۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ مشرقی بنگال، پنجاب کا ایک حصہ، سندھ اور بلوچستان کو چھوڑ کر باقی ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت اتنی طاقت ور ہوگی کہ بقیہ حصے مجبور ہو کر اس میں شامل ہو جائیں گے۔ جنگ کے بعد کے حالات کی بنا پر ساری دنیا میں مزدوروں کے جھگڑے کا اٹھ کھڑا ہونا لازمی بات ہے اور ہم بھی اسی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ میں نے تمہارا خط پنڈت جی کو دے دیا ہے''۔

خط کی اہمیت

یہ خط بے حد اہم ہے۔ ولبھ بھائی پٹیل پہلی بار ملک کی تقسیم پر رضامندی کا اظہار کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ پنجاب اور بنگال کے بٹوارے کا بھی۔ اس خط کی اہم بات یہ ہے کہ خط لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان پہنچنے اور وائسرائے بننے سے تین ہفتے قبل کا لکھا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں تقسیم ہند کی ذمہ دار برطانوی حکومت یا ماؤنٹ بیٹن پر کیسے عائد کی جاسکتی ہے؟ پٹیل نے خود یہ لکھا تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتی۔

18 مارچ کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک تجویز منظور کی جس میں برطانوی کیبنٹ مشن کی پیش کش اپنی تشریحات کے ساتھ منظور کی اور مسلم لیگ کو دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی۔ کاش جناح یہ دعوت قبول کر لیتے! مگر اس وقت وہ وزارتی مشن کے سلسلے میں کانگریس کی دو عملی سے اس قدر بے زار ہو چکے تھے کہ انہوں نے اس کی دعوت رد کر دی۔

گاندھی اور جناح کی آخری ملاقات

6 مئی کو گاندھی جی اور جناح، نئی دہلی میں آخری بار ملے اور پہلے طرح اس مرتبہ بھی اختلاف کرتے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ جناح نے گاندھی جی کی مرضی سے یہ بیان شائع کیا:

> ''ہم دونوں نے دو مسئلوں پر بحث کی: پہلا مسئلہ ہندوستان کو پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کرنے کا تھا۔ مسٹر گاندھی تقسیم کے اصول کو

تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں، تقسیم ناگزیر نہیں ہے، لیکن میری رائے ہے کہ پاکستان صرف ناگزیر ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا واحد حل ہے۔ دوسری بات جس پر ہم نے غور کیا، ایک خط تھا جس پر ہم دونوں نے دستخط کیے ہیں۔ اس کے ذریعے ہم نے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ امن برقرار رکھیں۔ ہم دونوں اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ اپنے اپنے میدان عمل میں اس بات کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اس اپیل پر عمل ہو اور اس سلسلے میں ہم بھی پوری محنت کریں''۔

3 جون کا اعلان

برطانوی حکومت نے 3 جون کو ہندوستان کی تقسیم اور اس کے ساتھ پنجاب اور بنگال کے بٹوارے کا بھی اعلان کر دیا۔ نہرو نے اس فیصلے کے بارے میں ریڈیو پر عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''میں جب آپ کے سامنے یہ تجویز رکھ رہا ہوں تو اس سے مجھے خوشی نہیں ہو رہی ہے، اگرچہ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ صحیح طریقہ کار یہی ہے''۔ 9 جون کو گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا سبھا کے بعد ایک تحریری بیان پڑھ کر سنایا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ جب میں تقسیم کی مخالفت کرتا تھا تو اس وقت میں عوام کی خواہش کا اظہار کرتا تھا لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ عوام کا رجحان تقسیم کے حق میں ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں عوام کو اپنی ذاتی رائے کے تسلیم کرنے پر مجبور کروں۔

آخر تقسیم ہو گئی

ملک کی تقسیم کا پلان ہر طرف سے منظور کر لیا گیا اور اس کے بعد تقسیم اختیارات کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس موقع پر سر چمن لال سیتل واد نے ایک سیاسی پیشگوئی کی تھی جو یہ تھی:

> ''ہندوستان کی تقسیم نے افراتفری اور تنازعات کے لامتناہی سلسلوں کی بنیاد ڈال دی ہے جو آنے والی نسلوں کو ناقابل تصور مصیبتوں اور آفتوں میں مبتلا کر دے گی''۔

کیا جناح پاکستان چاہتے تھے؟

میں سمجھتا ہوں کہ جناح پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ 1946ء تک وہ متحدہ ہندوستان کے لیے کام کرنے پر تیار تھے۔ میرے خیال میں وہ پاکستان کا مطالبہ پیش کر کے مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اگر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کانگریسی لیڈران سے کوئی سمجھوتا کرنا نہیں چاہتے تھے تو اس میں حق بجانب تھے۔ جب بھی کانگریسی رہنماؤں نے یہ دیکھا کہ برطانیہ سمجھوتے پر آمادہ ہو رہا ہے تو ان کے ذہن میں جناح کو نظر انداز کر دینے کا خیال فوراً آجاتا تھا۔ کانگریسی لیڈر سمجھتے تھے کہ ہندو مسلمان مسئلے کو کانگریس جناح اور مسلم لیگ نہیں بلکہ صرف کانگریس اور برطانیہ حل کر سکیں گے۔

ہندوستان تقسیم ہو گیا، بھارت اور پاکستان دو مملکتیں بن گئیں۔ جناح نے پاکستان نہیں جیتا...... کانگریسی لیڈر، نہرو اور پٹیل، جناح کو پاکستان ہار بیٹھے!

قائداعظم کی تقریر

14 اگست 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے (جن کو "قائداعظم" کہا جانے لگا تھا) جو تقریر کی تھی وہ آج بھی دہرائی جانے کے قابل ہے(1)۔ انہوں نے کہا تھا:

> "ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ اپنی مملکت کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے اور برابر حیثیت کے شہری ہیں۔ انگلستان کے لوگوں نے زمانے کے ساتھ، حالات کو سمجھ لیا تھا۔ وہاں کی حکومت پر عوام نے جو ذمہ داریاں ڈالی تھیں انہیں پورا کرنے کی خاطر حکومت کو بہت سے اقدام کرنے پڑے تھے۔ آج آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں رومن کیتھولک یا پروٹسٹنٹ فرقے کا عدم اور وجود بالکل برابر ہے۔ وہاں کا ہر

---

(1) پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا افتتاح 10 اگست 1947ء کو ہوا تھا اور اس اسمبلی میں قائداعظم نے اپنی یہ تقریر 11 اگست 1947ء کو کی تھی (ع ح ج)

شہری، انسان ہے اور بس۔ سب برابر کی حیثیت کے شہری ہیں۔ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں بھی وہی نصب العین اختیار کرنا چاہیے۔ اس طرح وقت کے ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے...... مذہبی اعتبار سے نہیں...... کیونکہ عقیدہ یا ایمان ہر شخص کا انفرادی حق ہے...... البتہ سیاسی اعتبار سے وہ سب ایک ریاست کے شہری ہوں گے''۔

مستقبل

بھارت اور پاکستان کو ہر حال میں ایک دوسرے کا دوست بن کر رہنا ہے، نہ تو ان میں جنگ ہونی چاہیے اور نہ انہیں جنگی حالات کے قریب جانا چاہیے۔ بھارت اور پاکستان کی باہمی منافرت سے امن عالم کو خطرہ ہے۔ اس برصغیر میں امن، صلح و آشتی کا سایہ رہنا چاہیے۔

11 ستمبر 1948ء کو محمد علی جناح کا انتقال ہوگیا۔ وہ مملکت پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے، ان کی قوم نے انہیں ''قائداعظم'' کا شاندار خطاب دیا۔ دنیا کی تاریخ میں ان کا نام ایک نئی ریاست کے بانی کی حیثیت سے لکھا جائے گا، لیکن میرے لیے ان کی حیثیت ایک ہمدرد اور مخلص دوست کی ہے، میں نے ان کی رفاقت اور دوستی سے بہت کچھ سیکھا اور پایا۔

ضمیمہ نمبر 1

کانجی دوآرکاداس سے انٹرویو

جون 1993ء میں سید شہاب الدین دسنوی کی خودنوشت سوانح عمری دیدہ وشنیدہ کے نام سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کتاب کے آخر میں انہوں نے کانجی دوآرکاداس سے قائداعظم کے حوالے سے لیے گئے ایک انٹرویو کو بھی کتاب کی زینت بنایا۔ اس انٹرویو کا متن حسب ذیل ہے:

16 فروری 1968ء کو میں نے کانجی دوآرکاداس سے ان کے فلیٹ پر ملاقات کی۔ وہ کافی بوڑھے ہو چکے تھے مگر دماغی حیثیت سے چاق و چوبند تھے۔ ان سے جو سوال جواب ہوئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

شہاب الدین دسنوی: مشہور ہے کہ لارڈ ویلنگڈن (گورنر بمبئی ریاست) کو ایڈریس دینے کی مخالفت کرنے پر پولیس نے جناح صاحب اور ان کی بیوی رتی کو زدوکوب کیا تھا، کیا یہ صحیح ہے؟

کانجی دوآرکاداس: نہیں۔ رتی زینے پر کھڑی سگریٹ پی رہی تھیں۔ وہاں پر بہت سے پارسی رضاکار جمع تھے، جو ایڈریس دیے جانے کے حق میں تھے۔ رتی سے شادی کے بعد سے پارسی جناح سے بہت خفا تھے اسی جذبے کے تحت موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک پارسی نے جناح کے منہ پر گھونسا رسید کیا۔ بعد میں جب میں نے جناح سے کہا کہ اگر وہ نالش کرنا چاہیں تو میں اس

پارسی کو شناخت کر سکتا ہوں۔ جناح نے کہا ''کیا تم یہ جانتے ہو کہ میں بھری عدالت میں کھڑے ہو کر یہ کہوں کہ اس شخص نے مجھے گھونسا مارا؟''

شہاب الدین دسنوی: کیا رتی کے والد ڈنشا پٹٹ ایڈریس کے معاملے میں اپنی بیٹی کے خلاف تھے؟

کانجی دوآرکاداس: ہاں، جب سے رتی نے شادی کی تھی ڈنشا پٹٹ نے ان سے بات کرنا ترک کر دیا تھا۔ پیرس میں جب رتی زیر علاج تھیں تو پٹٹ جو ان کی تیمارداری کرنے کے لیے گئے تھے، دوا پلانے کا وقت آتا تو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے اور کہتے ''رتی کے دوا پینے کا وقت ہو گیا''۔

شہاب الدین دسنوی: کیا جناح صاحب واقعی رتی کو چاہتے تھے یا یہ کہ رتی ان کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی؟

کانجی دوآرکاداس: نہیں، ایسی بات نہیں تھی۔ وہ کافی شفقت برتتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی دلداری کیا کرتے تھے لیکن ان کے درمیان سن و سال کا تفاوت حائل ہو جایا کرتا تھا۔ آپ کو جناح کا کوئی فوٹو رتی کے ساتھ نہیں ملے گا۔ جناح کو اس تفاوت کا ہمیشہ احساس رہا۔

شہاب الدین دسنوی: رتی کی وفات کے بعد جناح صاحب نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟

کانجی دوآرکاداس: رتی کی وفات کے وقت جناح کی عمر 52 سال تھی۔ اس زمانے میں یہ عمر دوسری شادی کے لیے مناسب نہیں سمجھی جاتی تھی۔

شہاب الدین دسنوی: کیا رتی، جناح صاحب کے ساتھ خوش تھیں؟

کانجی دوآرکاداس: سن کے تفاوت کے علاوہ جب کبھی جناح اپنی عدالتی کارروائیاں تفصیل سے بیان کرنے لگتے اور کبھی کبھی اسے دہرانے لگتے تو رتی بور ہو جاتیں۔

شہاب الدین دسنوی: جناح صاحب پہلے تو سر تیج بہادر سپرو سے بہت قریب تھے، پھر اختلافات

کیوں رونما ہو گئے؟

کانجی دوآرکاداس: بعد میں جناح کا ان پر سے اعتماد جاتا رہا۔

شہاب الدین دسنوی: کیا جناح صاحب فطرتاً شکی مزاج کے تھے؟

کانجی دوآرکاداس: اپنی بیوی کے معاملے میں ان میں شک کا جذبہ زیادہ تھا۔ انہوں نے ویلنگڈن کلب میں رتی کو کسی کے ساتھ رقص کرنے کی اجازت نہیں دی، البتہ مجھے اجازت تھی لیکن مجھے "ڈانس کرنا ہی نہیں آتا تھا"۔

شہاب الدین دسنوی: رتی کی موت کس طرح واقع ہوئی؟

کانجی دوآرکاداس: رتی نے خودکشی کر لی تھی۔ خواب آور گولیاں کھا کر۔ اپنی موت کے لیے انہوں نے اپنی سالگرہ کا دن چن رکھا تھا۔

ضمیمہ نمبر 2

1962ء میں کانجی دوارکاداس نے رتی جناح کی سوانح پر اپنی یادگار کتاب "رتی جناح: دی اسٹوری آف اے گریٹ فرینڈشپ" تحریر کی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے اور اس کا کوئی اصل نسخہ پاکستان کے کسی کتب خانے میں بھی موجود نہیں۔ اس کتاب کا مکمل عکس قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

RUTTIE JINNAH

The Story of A Great Friendship

By
KANJI DWARKADAS

To

NINA

My Grand Daughter

RUTTIE JINNAH was the gentlest, noblest and kindest of mankind. She lived a full, wonderful, interesting life. It is comparatively easier to write a story on Gandhi, or Nehru, or Annie Besant, than the story of one, brilliant as she was, who had never taken part in public life. Her story is one of an active life as an individual and of her inner life.

Wife of Quaid-i-Azam Mohammedali Jinnah, the great Indian political leader and statesman, later the Maker of Pakistan, she did not shine under the reflected light of her illustrious husband but was acknowledged to be the First Lady of Bombay. It was a great privilege to be invited by the Jinnahs to functions in their bungalow at Mount Pleasant Road, now occupied by the Deputy High Commissioner of the United Kingdom. Jinnah re-built the house in the forties, made it almost a fortress, but during Ruttie's life-time it was a Nineteenth Century bungalow and was known as "South Court". Jinnah bought it some time before his marriage in 1918. This is not merely a personal story, great as it is, of Ruttie. It is not just the story of a great friendship between her and me. The story is of a wider horizon

and importance, dealing with telepathy and clairvoyance, with life beyond the physical, and with the Search of Knowledge not understood or easily gained in this humdrum world. Ruttie was a great intellectualist, well informed, well read and balanced in her judgment of men and events but gifted with the curiosity of a research student. She and I worked together on planes not only physical but beyond the physical. The Psychical Research Society in England and the students of Para-Psychology in the U.S.A., particularly the Duke University, would be interested in some of our experiences and experiments which in all humility and modesty and objectivity I shall discuss.

Walking on a cold afternoon in February 1914, from the Elphinstone College across the Oval to the Queen's Road Tennis Courts, I saw a little Parsi girl of 14 coming from the opposite direction from the Chowpatty side in a small carriage driven by a pair of ponies—the motor age had not yet completely descended on Bombay eliminating the horse carriages. I could not take my eyes off this girl and watched the carriage and its occupant till it disappeared from sight. I could not forget her face. Three months later, I found from a photograph in a newspaper that this girl was Ruttie, daughter of the late Sir Dinshaw Petit, Bart. I did not then know anything about Theosophical Doctrines of Karma and Reincarnation, of Karmic Links of friends in past incarnations coming together once again in this or later births; otherwise I would have immediately spotted Ruttie as I did later as a friend of the past in the present incarnation and a friend to get together in future lives, one does not know where and when. Of course, I had heard casually of the popular Hindu belief of Karma and Reincarnation but that was based on superstition and tradition which Theosophy turned into reason and understanding and it

became a fact of life and just not a vague belief.

From 1916 onwards—the First World War was still on—thanks to the great spade work of Mrs. Annie Besant the political activities in Bombay as in the rest of the country increased. Public meetings were held in different parts of Bombay and at every such meeting came and sat in the first row the little girl Ruttie accompanied by her aunt, Miss Hamabai Petit, the multi-millionaire philanthropist. When Ruttie and I became friends later, she told me that she was watching my pranks on the platform. When I saw a speaker talking too long and irrelevantly, I poked a sharp pencil behind his knee as he was addressing the meeting and he lost his chain of thoughts, collapsed and resumed his seat and got wild with me. Ruttie told me later that she enjoyed my pranks.

In December, 1916, I went to Lucknow with Mr. and Mrs. Bhulabhai Desai and their young son, Dhiru. In next compartment were Ruttie, Hamabai Petit and the late Barrister D. N. Bahadurji. At big junctions Ruttie and Bahadurji were walking on the platforms. I saw her but did not meet her. Actually I did not meet her till after her marriage with Jinnah in the spring of 1918.

I remember having first met Jinnah in June, 1916, two months after I took my M.A., at a meeting of the Bombay Presidency Association. The meeting had an informal atmosphere. The Bombay Presidency Association was started in 1885 by the sponsors of the first session of the Indian National Congress held in Bombay in December, 1885, and during the late nineties, Justice K. T. Telang and Justice (afterwards Sir) Narayan Chandavarkar were its Secretaries. During the middle twenties, I was its Honorary Secretary along with

K. Natarajan and Faiz Tyabji, with the amiable Sir Dinshaw Petit, Ruttie's father, as its Chairman. It was always an all-party political organization and did useful work for several years. By the end of 1928 it was defunct. At this meeting, in June, 1916, there were about 25 people present. After two or three speeches, I saw somebody in check trousers, black coat, hair parted on the side and moustache, addressing the meeting and everybody listening attentively and respectfully. The speaker looked cheerful, was in high spirits and spoke with great confidence. He was summing up, trying to reconcile the different opinions expressed. I asked the late P. K. Telang who the speaker was. Telang retorted: "You don't know Jinnah?" Of course, I knew of Jinnah, but had never seen him before. He, then 42, had already made his mark as the leader of the Bombay Bar —well-known for cross-examinations and powers of arguing—and also in the Indian Legislative Council, the Central Legislature as it was then called. He was known as the Muslim Gokhale, emblem of Hindu-Muslim unity as Sarojini Naidu called him. Phirozshaw Mehta had taken Jinnah under his wings and young Jinnah was a leader of no small repute and importance even as far back as the pre-Gandhi period of 1916.

After the meeting Telang introduced me to Jinnah as a young Theosophist working under Mrs. Annie Besant. Jinnah bowed gracefully, showed friendliness and asked me to take to politics seriously and to work hard. This was the beginning of a friendship—I was only 24 then—which lasted unbroken right till his death in September, 1948.

The reasons for Jinnah's cheerfulness at the Asso-

ciation's meeting—I found later. He had spent the two months of summer vacation in Darjeeling with Sir Dinshaw and Lady Dinbai Petit and there he fell in love with their 16 year old beautiful daughter, Ruttie. As they returned to Bombay in early June, all Bombay heard of their impending marriage but the parents did not like the idea of their daughter marrying a Mohammedan. Ruttie was a minor but she was determined to marry Jinnah. The parents, as guardians of the minor girl, took a High Court injunction against Jinnah marrying or having any contacts with the minor. So, Jinnah and Ruttie had to wait. But time and separation did not make her forget Jinnah. As she reached 18, she, the brave girl, walked out of the parental house and the marriage was performed under Muslim rites, Ruttie being converted to Islam. This had to be done because the Civil Marriage Act at that time was rigid and stipulated that those marrying under the Civil Marriage Act had to affirm solemnly that they belonged to no religion. This would have made it impossible for Jinnah to remain a Member of the Central Legislative Assembly representing a Muslim Constituency.

At the Lucknow Congress the famous Congress-League Pact was made, blest by Lokamanya Tilak, Mrs. Annie Besant, Sir Chimanlal Setalvad and Jinnah among other leaders. Gandhiji was present at this Congress but took no active part; he was a silent observer. Apparently he was biding his time. This was the first Congress Session I attended as a delegate. Mrs. Besant was interned by the Governor of Madras in June, 1917. This made a great awakening in the country and the leaders who had so far kept away from Mrs. Besant and her Home Rule League joined it whole-heartedly, Jinnah in Bombay, Tejbahadur Sapru and Motilal Nehru in Allahabad. Jinnah became the President of the Bombay

Branch of the Home Rule League and Umar Sobani, Shankarlal Banker and I became the Honorary Secretaries and Treasurer. This brought me in daily contact with Jinnah and I was their guest at dinner practically every week after his marriage with Ruttie and here began the great friendship, though neither of us was conscious of it at that time.

On 10th December, 1918, the meeting, convened by the Sheriff of Bombay, was to be held at the Town Hall, Bombay, to vote a citizen's address to Lord Willingdon, the retiring Governor of Bombay, in their name. About 300 of us, Jinnah's followers, went to the Town Hall at 10 at night on the 9th December so that we could be the first to be admitted in the Town Hall when the gates opened the next morning. Eventually we were able to rush in the Town Hall at 8 A.M. and remained there until the police broke up the meeting in confusion at 6 P.M. and threw us out. Thousands of Bombay citizens had assembled on Town Hall steps and in the streets. Ruttie walked up the Town Hall steps at about 5 P.M. and stood bravely there inspite of police rowdism. Jinnah won the day and the address to Willingdon was not voted.

To celebrate the victory of Jinnah and the people of Bombay, a one rupee fund was started at the suggestion of Umar Sobani to build a Jinnah Memorial Hall. Within one month, 65,000 citizens of Bombay made a fund of Rs. 65,000|-, and the Jinnah Memorial Hall was built in the Congress House compound. Mrs. Besant came down specially to Bombay to declare open the Jinnah Memorial Hall and she paid a handsome and glowing tribute to Jinnah for his services to the country.

It is not out of place to point out that as far back as 1895 at the time of retirement of Lord Harris, the then

Governor of Bombay, some people got busy and planned to hold a public meeting of the citizens of Bombay to express commendation of his administration. There was considerable public opposition to this move. Dr. Deshmukh, Dr. K. N. Bahadurji and Sir Chimanlal Setalvad took an active part in this opposition. Ultimately, the promoters of the movement saw reason and the meeting that was called was confined to friends and admirers of Lord Harris.

Round about May, 1919, was held the First All-India Trade Union Congress at the Empire Theatre under the Presidentship of Lala Lajpatrai. Jawaharlal Nehru, N. M. Joshi, B. P. Wadia, Dewan Chamanlal, S. A. Brelvi and I were on the stage. Ruttie was sitting quietly in the side box. A resolution protesting against Horniman being deported out of India was moved by Ruttie and she spoke—fluently and faultlessly from the side box for five minutes. This was the only public speech that Ruttie ever made.

I used to meet Ruttie regularly now and again at meetings and at her house for dinners. She was a great nationalist, intensely interested in the political developments in the country and in the personal element of the political life of India. Mrs. Naidu was her as well as my friend and we had plenty to talk and discuss and Jinnah, of course, our leader, was equally interested.

On returning from Benaras and Allahabad on 2nd January, 1922, I went to see Jinnah and Ruttie. Bhurgri, the Sind Muslim leader, was with them. We talked till 3 o'clock in the morning. Next evening I dined with them and again we had about 7 hours' talk till 4 in the morning. Gandhiji had blundered inspite of C. R. Das's advice in refusing Lord Reading's offer to go to a Round Table Conference. Lord Reading had promised Full

Provincial Autonomy and diarchy in the Central Government. Jinnah was trying to help Gandhiji to come back to a more reasonable and sensible attitude and he had convened an all party conference to help Gandhiji out. Gandhiji did not budge but made a show of preparing for mass civil disobedience. I had told Mrs. Besant in Allahabad on the morning of 1st January, 1922, when she and I were both staying as guests of Dr. Tej Bahadur Sapru, that Gandhiji would not start civil disobedience and would find some excuse for suspending his movement and that is what Gandhiji did a couple of months later.

Ruttie was keenly interested in all this political work of Jinnah, participated fully in the discussions and hoped that the country would get near to Swaraj.

Having dealt so far with the political aspect of Ruttie's life and a strong nationalist tendency, it would be interesting to give two incidents of her contacts with Lord Chelmsford who was Viceroy of India in 1918 and Lord Reading who became Viceroy in 1921 before going to the personal aspects of Ruttie's life and her non-political interests and activities.

Soon after her marriage in 1918 she went to Simla where Jinnah had to attend the sessions of the Indian Legislative Assembly. She and Jinnah were guests at the dinner at the Viceregal Lodge and when she was introduced to Lord Chelmsford, she did not follow the British custom of curtesying to the Viceroy. Instead she followed the Indian custom and folded her hands after shaking hands with the Viceroy. Immediately after dinner the A.D.C. took Ruttie to talk to the Viceroy. Lord Chelmsford pompously told her: "Mrs. Jinnah, your husband has a great political future, you must not

spoil it. In Rome you must do as the Romans do." Mrs. Jinnah retorted quickly: "That is exactly what I did your Excellency. In India I greeted you in the Indian way." That was the first and the last time she met Lord Chelmsford.

In 1921 she was sitting next to Lord Reading at lunch in New Delhi. Lord Reading was moaning and groaning. He said to her: "Mrs. Jinnah, how I wish I could go to Germany. I very much want to go there. But I can't go there." Mrs. Jinnah asked: "Your Excellency, why can't you go there?" Reading replied: "The Germans do not like us, the British, so I can't go." Ruttie quietly asked: "How then did you come to India?" Reading immediately changed the subject.

In September, 1920, was held the Special Session of the Indian National Congress in Calcutta, when Gandhiji through questionable means was able to get his Non-co-operation Resolution passed by a narrow majority. Mrs. Besant, Jinnah and C. R. Das opposed the resolution. Motilal Nehru was also against it, as he told Jinnah in my presence, but his affection for his son, Jawaharlal, got the better of his judgment. We were all depressed. As the Congress came to an end I rushed up to the first row where Mrs. Besant was seated, helped her to collect her papers and picked up her attache-case. As she and I were about to go out I heard a big clash outside the pandal and found that the volunteers had come to blows. I told Mrs. Besant: "We shall have to wait here for some time, as there is some fighting going on outside." Just as I said this, I found Ruttie pulling me, saying: "Come on, take me out." I replied: "We cannot go, there is some fighting going on outside." Ruttie said: "That is exactly what I want to see, let us go quickly." I drew her attention to Mrs. Besant being

with me and promptly turned to Mrs. Besant and said: "The fighting seems to be over now, we can go", and I safely conducted Mrs. Besant and Ruttie out, and fortunately the fighting had really come to an end.

In May, 1919, Jinnah went to England along with other Indian leaders to give evidence before the Joint Select Committee of the Commons and the Lords on the Montague Bill. Ruttie went with him. Jinnah got into difficulties with some of the Members of the Committee whilst he was giving oral evidence. Lord Sinha who was Under Secretary of State for India, helped him out. A few minutes after Ruttie and Jinnah returned from the theatre a little after mid-night of August 14th-15th, their only daughter Dina (Mrs. Neville Wadia) was born. This is a strange coincidence, as 14th and 15th August are respectively Pakistan's and India's Independence Days.

Mahadev Desai in his Diary makes more than one reference to meetings between Gandhi and Ruttie.

Gandhiji asked Ruttie to get Jinnah to agree to boycott of *all* foreign goods including British goods. Ruttie told him that boycott of all foreign goods, or British goods was neither politically wise nor was it practicable. Ruttie and Jinnah were in agreement with my views as expressed in an interview with the 'Evening News of India' in May, 1924, soon after the first Labour Government with Ramsay Macdonald as its Prime Minister took Office:

"Mr. Kanji Dwarkadas, who intends to move a resolution at the June meeting of the Bombay Municipal Corporation for the removal of the ban against

the British Empire goods, gave a representative of the "Evening News" the reasons which have led him to take this step.

"The boycott resolution was passed by the Corporation seven months ago by a large majority on the motion of Mr. Vithalbhai Patel, then leader of the Nationalist Party, with the support of many Liberals and Independents. The immediate object of the Corporation in doing that was to express their disapproval of the decision of the Baldwin Cabinet regarding Kenya.

"Mr. Kanji observed that he had many reasons to back up his resolution, but he contented himself with giving our representative two main reasons.

A POLITICAL GESTURE

"Firstly, he is strongly of opinion that every party in India ought to co-operate to the fullest possible extent with the Labour Government and give them an opportunity of fulfilling the promises made by the leaders of the party to do justice to India, not only as regards Kenya, but also as regards much bigger and broader question of granting full responsible government to India. "The fine record of work done by the Labour Party," said Mr. Kanji, "ever since it came in office, ought to make us feel optimistic and in order to remove all difficulties from its way, it is but fair that we should on our part give it all possible help and support, which it will need to fight the reactionary elements in its own country. To my mind one of the best ways of doing this is to give up the boycott of British Empire goods."

A FAILURE IN PRACTICE

"Mr. Kanji's second reason is the difficulty of giving practical effect to the boycott resolution. As a member of the Standing Committee of the Corporation, he made that admission. He said most of the requirements of the Bombay Corporation were for the executive engineer's department and goods of the best quality were obtained in the United Kingdom, and at the cheapest prices. "Day after day," Mr. Kanji averred, "we in the Standing Committee have sanctioned the purchase of British goods after asking the Commissioner if he could not obtain non-British Empire goods. What non-British Empire goods can be bought, we can easily obtain in India, and, therefore, whilst it would be perfectly right and necessary to insist on our resolution to buy Swadeshi (Indian made) goods, the time, I think, has come when we must face facts as they are and rescind the resolution which we have never been able to work satisfactorily."

In the light of the world events of today and with co-operation and friendship between all nations being so essential for the maintenance and progress of the right type of civilization and our natural anxiety to export Indian-made goods to foreign countries one must admit in all honesty, as some of us realised as far back as forty years ago, that the civil disobedience movement, and non-co-operation, including boycott of foreign goods, were harmful and disastrous to our country and delayed the advent of Swaraj by about fifteen years. Who knows if these negative movements had not been launched, Jinnah would well have been the first Prime Minister of a happy undivided United India and Pakistan would never have been thought of and would not have

come into existence in 1947.

Gandhiji was warned by Mrs. Besant about the dire consequences of his mass movement of disobedience of laws. Early in February, 1919, Gandhiji underwent a serious major operation, which was extremely painful, Mrs. Besant arrived in Bombay on the morning of the 14th February at 6 and sent me to Gandhiji to arrange a meeting with him. I saw Gandhiji at 9; he was jumping in his bed with terrible pain and suffering. I told him my mission. He said he was sorry that he was too ill to go and see Mrs. Besant. I told him she knew this and, therefore, she had suggested that she would go and see Gandhiji at his house, second floor, Laburnum Road. Gandhiji said: "No, no. I cannot agree to this. How can the old lady walk up to the second floor?" I remember my answer: "You know Mrs. Besant as much as I do. You know she will not take 'No' from me about her seeing you. She has come down to Bombay only to see you and she is leaving again to-night for Madras. I cannot go back to her till I have fixed up with you the appointment. Therefore, all that I want from you is the time for this meeting." Gandhiji laughed in spite of his pain and he fixed 3 p.m.

Mrs. Besant and I spent one hour with Gandhiji. She told him of the dangers of mass civil disobedience movement. She had vast enough experience in her life of 72 years of the dangers of exciting mob frenzy, which, once excited, could not be controlled. She told him where Gandhiji's movement of civil disobedience would lead to, burning of post offices, cutting of telegraph wires, loss of respect for law and order, rioting and every kind of violent upheaval. She told Gandhiji that she knew that he was too ill to speak and, therefore, would do all the speaking. Gandhiji did not accept her advice and

warning and he went ahead with his movement of breaking laws.

Here I must record a personal experience. About 15th May, 1919, two or three days before she sailed for England as the leader of the National Home Rule League Delegation to give evidence before the Montagu Bill Joint Select Committee of the Parliament, I had tea with her. There were three or four other friends present. The conversation was of a general nature. As she handed over to me my cup of tea a thought passed in my mind, which I did not express in words, whether when Mrs. Besant talked to Gandhiji three months back, she had seen clairvoyantly the coming events of the last three months: she had foretold the rioting, mob violence, burning of post-offices and telegraph offices, etc. in different parts of the country.

After tea she took me aside and said: "My dear, it was not clairvoyance, it was political experience that made me feel what was likely to happen and I had to express my fear to Gandhiji frankly.' Mrs. Besant 'read' my thought and answered it !

In 1920, she told Gandhiji when he was once again contemplating mass civil disobedience and non-co-operation movement that the day of victory for India (that is when India attained responsible self-government and full freedom) would be the day of biggest defeat and unhappiness of Gandhiji, because the spirit of indiscipline and lawlessness, resulting in loss of respect of law, which he was inculcating through civil disobedience, would react against the Indian Government and people would disobey authority on the lines taught to them by Gandhiji. Mrs. Besant's words have come too true ! How many years, how many years, will it take India to

forget and wipe off this terrible legacy which Gandhiji has left us?

I was extremely busy with the Budget Session of the Bombay Legislative Council, where I was a Member for Labour in the first three months of 1922 and I am afraid, I must have neglected Ruttie. One night in May I had a dream in which I saw Ruttie lying on a peculiarly shaped old fashioned sofa with electric fittings behind her sofa on the wall and a landscape picture, and in that dream Ruttie said: "Kanji, help me." Next morning as I woke up I remembered the dream, but it made no impression on me and I took no notice of it. The next night the same dream appeared with all the details of the first dream including Ruttie's call for help. Once again I remembered the dream when I woke up in the morning but apparently attached no importance to it though I felt that it was rather strange that the same dream came to me on two successive nights. On the 3rd afternoon at about 5, returning from office and without remembering the dream I called at Jinnah's "South Court". I had not seen Ruttie for some weeks and this was the first time that I went to Jinnah's house without a previous appointment. As I got out of the car, Jinnah's servant met me and told me that Ruttie was ill. I gave him my card and I asked him to give this card to Ruttie and I was about to get into the car to go away. But the servant said: "Please wait, she may be wanting to see you, let me go and give the card to her." In a minute he came back and said that Ruttie wanted to see me and I was taken to the back varandah where she was lying. Imagine my surprise when I saw her lying on the sofa with the electric fittings behind her and the picture just as I had dreamt for two nights in succession. I said nothing about the dream to her at that time. Two years later when we had become great friends I gave her the

full story about this incident. We kept on talking and Jinnah returned home from his Chamber at about 7.30, asked me to have a drink with him and to stay on for dinner. I said I was there since 5 o'clock and I did not stay for dinner.

In September, 1922, I was in Poona for the meetings of the Legislative Council. One day as the Session was in progress, I left the Council Hall, went to the Empre Gardens and sent her the most beautiful roses, as I knew Ruttie was going to England in a week or so. It is not quite irrelevant to say that there are no roses in the garden since Independence. The Government had cut down the malis from 105 to about 35 and the gardens are in a state of neglect. The Government of India and the Government of Maharashtra talk about making new National Parks, but they neglect the century old garden. Ruttie received the flowers and later she wrote to me (25th September, 1922):—

"On Thursday we are due to reach Aden, and as I find your name among those heading my list, you can understand the date that tops this letter. Not that I have such a formidable budget to get through —but while riding the seas I drop my characteristics and become cautious. As many of you who have known me on tea times can ever imagine—for my intestine is ever on the defensive against the surging surface. Your wire for which I must thank you only gave me a further proof of the thoughtful consideration you have always shown me, and more especially during my recent illness and I take this opportunity to express my appreciation of your kindness. It will always give me pleasure to hear from you, so if ever you happen to have a superfluous moment on your hands, (please make in the correct chamber on the

Corporation. You are a 'City Father', aren't you?) you know how now

C|o Messrs. Henry S. King,
London W.

will find me if I don't lose myself—And just one thing more—go and see Jinnah and tell me how he is—he has a habit of habitually over-working himself, and now that I am not there to bother and tease him he will be worse than ever.

"And now Good bye to you and the best of luck."

"P. S. Reach Wed. and not Thursday
as I have understood.

R.J."

This letter made me realise that my having gone to see her in May was not just accidental, but was the result of a message given to me by her outside the physical plane. This raises straight away the problem of telepathy or message through dreams when a physical body is asleep. Telepathy—transference of thought—is now a recognised fact. The Psychical Research Society and the Duke University research professors of Para-Psychology do not understand the basis of such thought transference. According to my studies and the teachings given to me in Mrs. Besant's books and by her personally to me, what is known as telepathy is actually a conscious or sub-conscious or unconscious meeting of people outside the physical body. I cannot here explain this further. It should be sufficient for the moment to refer to Mme. Blavatsky's and Mrs. Besant's books on different aspects of the world beyond the physical.

Ruttie was intensely interested in contacting the non-physical world and she made difficult and dangerous experiments to verify her beliefs and convictions. She wanted first-hand knowledge. She thought she could get it through Seances with the help of mediums or table-tapping.

She wrote to me on 21st November, 1924:—

"Thank you for your letter. Yes do look in when you are free, and if you will but ring me up and let me know I shall make it a point of stopping in to see you.

There is a matter about which I am most anxious to speak with you, as I think you can help me. Lately I have been very much drawn towards the subject of Spirit Communication and I am most anxious to know more and to get at the Truth. It is such an elusive Subject and the more I hear of it the more puzzled do I become, though still more passionately interested. I have some sort of an idea that you must be cognisant of spiritual circles in our City, whose Seance one may join. I don't profess any creed nor do I subscribe to a belief, but of late willy-nilly I have been propelled towards the study of so called spiritual phenomena and I am too deeply immersed in the matter now to give it up without some personal satisfaction for I cannot content myself with other peoples' experiences, though I fully realise that in a matter of this nature one doesn't always get the evidence one seeks.

"Anyway I wonder whether you can assist me in this matter by recommending me as a "medium" or 'Clairvoyant' professional or otherwise. I would

prefer my identity, however, to remain unknown while you make enquiries. And I sincerely hope that you will be able to assist me. With my kind regards to your wife and yourself."

"P.S. Mrs. Besant might know of
some reliable 'Medium'."

My understanding of the problem, thanks to Mrs. Besant's teachings, was that seances were not only unsafe guides for getting such knowledge and experience, but they were dangerous to all those who participated in them. To my mind the seances weakened the mind and the spirits of those who indulged in them and further they made people credulous. Bacon had rightly said that credulous people are as dangerous as deceitful people as the former in their credulity spread falsehood in the same way as the deceitful people do. There is nothing spiritual in seances. But I wanted to help Ruttie and I did not just want to disappoint her in her search for direct evidence. Straightaway to tell her that she was following the wrong type of approach would not have helped her. I had to reason and argue and explain to her my point of view and I am happy to say that I was successful in weaning her away from a fruitless effort.

In December, 1924, the Theosophical Convention was held in Bombay and among those who participated and spoke at the Convention were Mrs. Besant, J. Krishnamurti and Jinarajadasa and this gave me an opportunity to help Ruttie. At my request Mrs. James Cousins saw her and had a long talk with her. Ruttie wrote to me on 28th December, 1924:

"I was delighted to meet Mrs. Cousins and I feel that as I owe you the pleasure I should thank

you for having given me the opportunity.

"She is a charming woman and was very patient and helpful though of course what I am after is a Seance controlled by some experienced medium—professional—or otherwise; as I am most anxious to get a personal experience of this matter in which I so passionately believe.

"Mrs. Cousins very kindly took me with her to Theosophical Meeting at which I listened to a most inspired address by Mr. Jinarajadas. What a charming wife he has, by the way! Looking into her face (it is one of those faces one looks into and not at) I understand for the first time what is meant by a 'radiant face'. I must confess I fell for her absolutely and I hope that you will try and arrange so that I may meet her some time when she happens to be in Bombay.

"Do come and see me soon so that we may resume our chat of the last occasion.

"What is your opinion of 'Towards the Stars? I only wish it hadn't been marred by the waggish self-assurance of the author. But more of that when we meet. Until then let me thank you once again for having brought me into contact with a very charming and rare type of womanhood."

"South Court,
7th April, 1925
Midnight.

"I am afraid it is too late to get this posted now. So I should have dated it 8th. However it hardly matters!"

"My dear Kanji,

Yes, I know of the dream travels of which you speak. But I do all my dreaming in my waking hours. I am not being waggish. There is nothing I would welcome with greater rejoicing than an experience of the sort to which you refer in your letter, but in my heavy druglike sleep there is no redeeming feature and besides the five or at most six hours rest it ensures a restive mind, and a correspondingly restless physical state it has *no* value. I don't dream excepting very rarely and then I wake up only to the consciousness of having dreamt, and no more.

"My soul is too clogged! and though I aspire and crave, God knows how earnestly! how intensely, my researches remain uncrowned—even by thorns! I am feeling peculiarly restless and wish one with psychic powers could come to my assistance.

"My proud soul humbles before the magnitude of this subject and in my estimation those of us with Second Sight and other such psychic powers should rank with the world's poets and songsters for their gift if more intelligible is also more divine. The seers and the saints should stand among the world's prophets. After all we are at present too blind and unseeing to comprehend what the psychics would reveal to our half demented senses. But what the mind often revolts at, and refuses to accept, the intrinsic self within us admits with certain ease which makes the more thoughtful ponder; as though it had some ancient and original knowledge of its own.

"There is much to clear away, and almost as much to mend, before I can dare to feel disappointment, because certain signs and manifestations for which I long and contrive do not occur. But I am weak and spoilt by indulgence, and to drive myself is a task to which I don't impose a time limit for obvious reasons.

"I have written much, but I feel confident that it is in the sympathetic hands and they will be understanding eyes that read what I have said.

"As I have already told you, you have but to let me know by phone or a written word when you are free to come, and you will be more than welcome.

Yours sincerely,
Ruttie."

"R.J. South Court,
12th April, 1925.

My dear Kanji,

Thanks for the books. I have been wading through them. But they are nothing as exhaustive as H. P. B.'s 'Secret Doctrine'. The number of points that book has elucidated for me is remarkable. I have a very confusing mind as one should have in serious matters of this sort and though I have often referred to standard authors on the subject, they have not given a particle of the help H. P. B. has, and yet if I take up the Secret Doctrine, it is more often than not that I have to put it down in utter bewilderment. It is so supremely elusive! And though I have read quite a respectable lot on the subject, I have never come across anything quite so easy to *follow* nor yet quite so hard to *grasp*. I wish I could get hold of somebody to guide me on such matters as puzzle me, one whose knowledge could save me when I stumble. By the way, do let me know whenever there are any lectures etc. to be heard on the subject worth the hearing as also if there is any journal to keep one posted with the latest development. "Light"—I of course know of—but has it an Indian counterpart?

"I am slowly, but surely drawing J's interest into the matter and by alternate bullying and coaxing I got him to read that book 'The Spirit of Irene', of which I had spoken to you at the time of lending you 'Towards the Stars'. I wished to give it to you but could not find it at the time. It is really the most conclusive piece of evidence that has come my way ever since I first interested myself in Spiri-

tualism. However, J. had to admit that it was remarkable and irrefutable. There is no other feature to recommend it. Neither refinement of thought nor any marked literary ability and though it does provide a solid bit of evidence it is not of a nature to appeal to one who already believes. Besides the result of the whole experiment is such that it can hardly be expected to appeal to those of our way of reasoning. The incident deals with the tracing of a murder and the ultimate bringing to justice of a murderer. I think judgment would be better responded. There is a notorious crime known to criminal annals as the Boscombs Murder and it revolves round a poor girl—a cook—who was decoyed from London to Boscomb and then done to death, the details of the crime are horrible, it having been a crime of lust. The police being baffled by the cunning of the man, were at their wits end, or you may be sure they would not have consented to hold Seance. Anyway they got the needed clue and the evidence was of such a nature that the unfortunate man was hanged.

"The book gives the names and designations of the respective witnesses and as the book has now gone through two editions without calling forth any word to the contrary either from the police officials therein mentioned or any others, I suppose that one may reasonably surmise that the author speaks with knowledge. J. was not at all events able to find any flaw in the case.

"It doesn't look as if we were going to Kashmere after all, as J. is engaged in the Bawla case. So it is more than likely that we shall remain in Bombay. With K. regards.

"P.S. I have written to Chatterjee, the Artist, for whose address infinite thanks. I have asked him to do three reproductions for me in varying sizes. I am awaiting the answer with impatience and hope that he accepts the commission.

By the by, I am very excited and equally happy as at last I have two manifestations, one was a most extraordinary luminance—a sort of perpetual flash suspended mid way at the corner of Hughes Road and Sandhurst Bridge." (Ruttie used to call Jinnah 'J').

Every week I used to send her books on all kinds of subjects—she was a voracious reader—and we discussed them when we met. I wrote for her reviews of the more important books including reviews of plays of Noel Coward. As they were written in my own handwriting, no copies were made. Jinnah also read them and enjoyed my comments and criticism.

On 13th May, 1925, Mrs. Dorothy Jinarajadas wrote to me from Adyar, Madras:

"Thanks very much for your letter. I think now that in these days you are writing so many articles, you might write me something for 'Stri Dharma'. I want articles on the lines of Child Marriage, also anything to do with labour problems where they concern women, or really anything on the lines of the special work that you are doing. If you can send me some articles, I should be most grateful to you.

"I am so glad to hear Mrs. Jinnah is so really interested in Theosophy, and also, incidentally in me! I shall be very glad to see her again next time I come to Bombay. Of course, she has a tremendous lot in her if only she will allow it to come out, and she is so clever and intelligent also."

At Ruttie's request, I had written to Dorothy asking for information for the Theosophical School for girls in Adyar as she had thought of sending her six year old daughter, Dina, to that School. On August, 29, 1925, Dorothy replied:

"I do hope Mrs. Jinnah will send her daughter to the School, for I am sure she must be a very intelligent girl, and it will be worth while her having a good education."

Again on 29th October, 1925, Dorothy wrote to me:

"I imagine that you are now quite strong as you sound to be going on finely with your work. I was so interested to get your long letter regarding your Vigilance Committee work. We are progressing here. Mr. Shesha Iyengar has drawn up a Bill to regulate brothels. It is a fairly satisfactory Bill. I do not know if it will get through without trouble as the Commissioner of Police here wants to insert a clause regarding licensing brothels and segregation. That we oppose absolutely. That system has failed in all countries and where it is still in force they are trying to get rid of it. It has not in the least checked disease. We have an added difficulty in Madras owing to the Devadassi system but, rather with difficulty, I have got the Committee

not to put in a clause excluding Devadassis. They must be classed as ordinary prostitutes and those who live on the earnings of the devadassi must come under the same law as others who do this.

"I hope you have received satisfactory answer regarding the School and it would be good for Mrs. Jinnah's child to go there. Is Mrs. Jinnah really doing the Vigilance work? It will be splendid if you really get her interested and working. She can do so much."

All throughout 1925 Ruttie and I met regularly 3 to to 4 times a week. On 5th June 1925, she wrote to me:

"Had it been any other I would not have dared to delay this so long. I have nothing to plead in explanation and my apology, however late, is none the less sincere. We missed one another just by eight minutes. I went out having forgotten all about our appointment, but suddenly recollecting it I raced back to find, alas, that you had been and left but a few minutes since.

"I have been ill again, so almost any evening will find me at home.

"It is nearing 2 A.M. I am frightfully tired and sleepy but the thought of you having come to me I simply had to crawl out of bed to write to you—to ease my conscience if nothing else. Will you excuse me and let me get back now. My apology I know is hopelessly inadequate."

She told Jinnah in July, 1925 that she would go with me to the Jubilee Theosophical Convention in

Adyar (Madras) during the Christmas week. The Muslim League was to meet at Aligarh, but Ruttie had already made up her mind to go with me and my wife and my four year old son to Adyar. She told me that she wanted to join the Theosophical Society and wanted to be initiated as a member by Mrs. Besant. This was one of her reasons why she was keen on coming to Adyar.

Unfortunately, her cat fell ill and she could not go along with us but followed us there after a week. Jinarajadas suggested that she should stay at the hotel in Madras and not in the not so comfortable temporary huts in Adyar reserved for delegates and visitors. During the week before she came to Adyar she daily sent me a telegram.

Every afternoon she came to Adyar and attended meetings and lectures. One evening Mrs. Besant took her to her rooms and she was with her for half an hour and she had a long discussion with Mrs. Besant. Just then were introduced at the morning meetings what came to be known as Universal Prayers—recitation from scriptures of different religions. Ruttie told Mrs. Besant that she had come to Adyar to join the Theosophical Society but bringing back these forms of religion had upset her and she was, therefore, hesitating about joining the Society. Mrs. Besant, than whom there was no more understanding, tolerant and kind being in the world, told her that it was not essential for a serious minded and genuine person like her formally to join the Theosophical Society as a member. Ruttie asked me if I would be disappointed if she did not join the Society and if I still so wish that she should, she would certainly do so. I told her that just like Mrs. Besant I would not interfere with anybody's decision, and that I myself felt upset over the Universal Prayers. Later when I met

Mrs. Besant I told her it was to run away from all forms of religion that I had joined the Theosophical Society and that I would not attend those prayers.

I pointed out to Mrs. Besant that those outer forms of religions besides setting a premium on laziness let ignorant fools, humbugs and hypocrites and superstitious people to pose as being very religious. She understood and appreciated my point of view and smiled at my strong reaction against the prayers and told me that there was nothing wrong with my point of view. I made the same complaint to Gandhiji in January, 1937 in Trivendrum, but he would not agree with my opinion—he was exploiting for political purposes these public prayers to keep and continue his hold on ignorant and superstitious people. His public prayers were nothing but a farce.

I saw Gandhiji at Juhu on the 17th May, 1944, a few days after he was released from the Aga Khan Palace in Poona. Gandhiji had gone to stay at Juhu to recoup his health. He was just about to begin his evening public prayer and I sat through the prayer quietly, next to Mrs. Vijayalaxmi Pandit. After the prayers, I asked her what place these prayers would have in the Kingdom of Jawaharlal. First she gave a vague and evasive reply, but I pressed for a clear reply. She finally admitted: "This prayer is a farce and I do not believe in it. I only attend it out of my respect for Gandhiji."

Mrs. Monica Felton in "I met Rajaji" quotes Rajaji (Mr. C. Rajagopalachari): "In our faith the stress is on individual worship. Gandhiji encouraged congreasional worship and so does Vinoba Bhave, both of them mainly for national reasons, but the genius of Hinduism is gentler than that."

Mrs. Besant was very fond of Ruttie. She was not in the habit of lunching or dining out but she made an exception in the early twenties when Ruttie asked her to lunch with her. At Adyar Mrs. Besant told me after her meeting with Ruttie: "Look after your great friend, she is unhappy." When I showed surprise at what she said, she exclaimed: "Don't you see unhappiness in her eyes? Look at her."

Lady Emily Lutyens asked Ruttie to dine with her at the Theosophical Headquarters and at this dinner, there were about 25 other guests including Krishnamurti, Betty and Mary, Lady Emily's daughters, David Graham Pole, Sivakamu, Ratansi D. Morarji, Ruth Roberts, Helen Knothe, Dwarkanath Telang, myself and many others of different nationality—British, French, American, Australian, Dutch, Austrian, etc. Truly it was an international gathering and the languages spoken at this dinner were English and French.

One evening that week when Ruttie and I were dining with Jinarajadas she, requested him to magnetise something for her which would then protect and help her. Jinarajadas promptly replied: "Why ask me? Your friend Kanji can do it very well for you."

On 31st March, 1926, she wrote to me:

"I have received a letter from Mrs. Cousins from which I gather that both her husband and herself must have left for Europe by now. In fact they must be on the high seas.

"Now when I had visited the Theosophical Conference to Bombay last December-January, I gave an order for three reproductions of Chandrasekhara

in varying sizes. I have waited all this time impatiently for them and imagine my disappointment when after all these months only one copy turns up, and as in her letter Mrs. Cousins makes no mention of the other two, I feel quite disappointed. So I am writing to ask you if you could help me out by directing me to whom I should appeal in this matter the Cousins having already sailed. Moreover, I have not been sent any bill on account of the picture I have received and as no mention of any price was made at the time of the order, or after for that matter I am at a loss to know what to do. Will you not help me out? Do please make the necessary enquiries as to who is filling Cousins' place during the period of his absence. For whoever that happens to be, would, I should think, be the man for me. Besides, I *must* get those other copies or I shall be quite frantic and I am sure you don't want me to lose my equilibrium!!!

"You are never visitor these days. I nevertheless am going to be daring and invite you to dine with me on Saturday. Do you think you can come? I am sure you will if you are free!

"With our kindest regards both to yourself and Mrs. Kanji."

A few months later in 1926 Ruttie and Jinnah were once again going to England, Jinnah to attend the meetings of the Sandhurst (Army) Committee, presided over by Gen. Skeen. Ruttie told me: "Kanji, I am going away to Europe and U.S.A. for a few months. You will not be with me to protect me and help me. Do please, therefore, magnetise something for me to keep me in touch with you." I hesitated but she insisted that I do

so. So I asked her to give me a precious stone and said I would do my best. She gave me a jade, it was a beautiful jade. I magnetised it with thoughts of love and protection with particular reference to protecting her from any adverse effects of seances.

She returned in last week of August, 1928, and she wrote to me on September 1st:—

"If you are free on Saturday do come and dine with us.

"Have you made up the sleep you must have lost last Saturday—5 O'clock in the *morning* is an early hour at which to be out and barely respectable. If ever I have to be up by 5 A.M. I generally don't go to bed at all it hardly seems worth the while!

"Anyhow do come, both J. and I would feel so pleased."

I casually asked her if she had attended any seances, and how she reacted to them.

She jumped out of her sofa and exclaimed: "Good God! What kind of thoughts you put in that jade?" I said: "Well, why, what happened?" Ruttie said she had made three appointments for attending seances, once she missed the train, second time the medium did not come and so nothing happened and the third time she forgot all about the appointment. "Tell me, what thoughts you put in that jade?" she asked again. I told her what I had done. She felt grateful and I know that she never any more thought in terms of seances. Jinnah was throughout sceptical of this business of magnetising and thought transference and used to laugh at Ruttie and

me. But Jinnah was equally grateful to me for having helped Ruttie to give up her fruitless and dangerous pursuit.

The following letter from Ruttie gives further proof of her great affection for me and her understanding of my thoughts and feelings without my so much as whispering to her. This letter also made me realise that it was not just me who was looking after her, protecting her and helping her, but that she was equally looking after me and watching me to see that nothing untoward happened to me. This is the letter:

"Ever since the other night when you had pot luck with us have I been obsessed with the idea that you are troubled. I have tried to put away this thought as just merely the disordered fancy of ill-health, but it persists and so I am being true to instinct—not without an effort, and writing this to you.

"I suppose we all have our moments of melancholy and moments when everything seems to be impending and yet nothing happens—a sort of waiting mood, and one just waits and waits and grows distrustful of life.

"But I feel you are troubled—troubled—troubled, and I too begin to become restless and unhappy. Anyway you know that you can come and see me whenever you want and that I am always glad when you come. So don't please let any idea of my not being strong enough and well enough keep you away, if you feel the need of friendship that understands without explanation."

"P.S. I am quite alright again and were it not that my feet are ugly and swollen I should be getting about as usual. As it is I go calling at my friends and to-night I am going to cinema—in bed-room slippers as no shoes are large enough to accommodate my elegant and lily-like feet ! !

Had X-rays taken and find that the broken needle is still there, so am trying to make up my mind to undergo another operation.

R.J."

Here is an extract from another interesting letter: —

"You are a dear !—and the more I think on it, I feel you had no business to be born into the world with 'Dhoti'. The correct setting for a nature of such fine sensibilities is a Sari—or a Skirt as the case may geographically require.

"Yes do come and see me tomorrow. It is awfully good of you to have been so regular. I know what callers there are on your time !"

Ruttie, as one can see from her letters was extraordinarily clever, full of understanding, full of affection and had a noble heart.

Her sympathies went far and wide. The strongest point in her character was her affection and devotion to the animal kingdom, she loved and adored her pets, not only her own pets but whenever she saw an ailing cat or dog, one was sure that she would go and try to

remove the pain and suffering. She had a large number of dogs and cats and she was personally devoted to each one of them and looked after them. She was unfortunate in her friends of the animal kingdom because many of her pets died inspite of her kindness and care and she suffered terrible unhappiness as a result. She and I worked together for many months to investigate the conditions in the Pinjrapoles in Bombay (Bhuleshwar), Chembur and Kalyan. We went for weeks together thoroughly into the conditions of living of the suffering animals, suffering because not proper care was taken of the animals in the Pinjrapole. After months of our work she and I sent a letter to the Trustees of the Pinjrapole. We made many constructive suggestions to improve the running of Pinjrapole and to improve the conditions of the inmates of Pinjrapole. We also wrote to the Bombay newspapers. We wrote the following letter dated 2nd September, 1927 to the Indian newspapers:—

"Sir

We enclose for publication in your paper a copy of a letter sent by us to Mr. Velji Lakhamsi, the Chairman of the Managing Committee of the Pinjrapole Trustees. So far we have received no acknowledgment to the letter. The illustrious gentlemen have remained unmoved—the conditions have remained unchanged.

"We visited Chembur last week and the condition of the inmates is an indictment to any self-respecting trustee. We saw dogs with matter oozing from their skins in the last stages of violent eczema —dogs with wounds, which through dirt and neglect had decayed the flesh around causing sinuses which

had eaten an inch deep into their flesh and which, on the resident Vet's own admission he had not even noticed.

"Out of a number of 26 dogs, there are only 5 who were apparently free from infection—the callousness of those in charge, however, is such that these animals were penned up in the same enclosure along with the rest, whose appearance one and all made one's heart sick. Had there been any dearth of space—it might in some slight measure have mitigated the offence but there happened two roomy enclosures which were unoccupied.

"Most of the dogs which had been there some time gave one the impression of being in the last stages of starvation. The drinking water was as foul as on our previous visits. The refuse, instead of being removed, was heaped in the enclosure and served as a magnet to myriads of flies, which would alternate their attention between the open sores of the victims and the delectable mound of filth.

"Though in a lesser degree, we noticed that the same conditions prevailed among the doggy inmates of Bhuleshwar. On remarking that there was no segregation of sick dogs, we were told by the Vet in charge that all dogs were admitted at this branch and after examination or treatment as the case required, the healthy ones removed to Chembur—in other words to death by slow torture besides which a slaughter house would pale into insignificance.

"Neglect is apparent in the wards reserved for horses and cattle as well and the suggestions submitted by us to the Committee have enumerated various directions by which, without any undue ex-

pense, improvements could be effected. The death-rate tells a tale, which should have stimulated into action the most apathetic of Committees, and we appeal to the public of Bombay to bestir themselves and whip these gentlemen into action.

Yours, etc.
R. Jinnah
Kanji Dwarkadas."

The Indian Daily Mail published the following on 12th September, 1927:—

"We published last week a description by Mrs. M. A. Jinnah and Mr. Kanji Dwarkadas of the terrible conditions in which infirm creatures, especially dogs, are kept in the Bombay Pinjrapole. Hearing the tragic tale from Mrs. Jinnah, Mrs. Sarojini Naidu, accompanied by Mr. Kanji Dwarkadas, visited the spot. Her letter to Mr. Kanji Dwarkadas confirms the gruesome account first published. We give Mrs. Naidu's impressions below in the hope that public conscience will be raised on behalf of the helpless creatures kept by their care-takers under conditions of torture and living decay. Mrs. Naidu writes:—

Taj Mahal Hotel,
Bombay, Sept. 9,

"Dear Kanji,

I am just leaving for Simla but before I go, I want to beg of you not to be content with writing a letter or two to the newspapers, in regard to the Pinjrapoles.

"My visit three days ago to the Chembur Pinjrapole is one of my saddest memories and I am haunted by the pitiful wail of the wretched dogs in the last agonies of living death. Dante would have, I think, another corner in his Inferno had he heard that incessant cry of misery.

"The horses are in a somewhat better condition than I expected, but they need far more sanitary conditions. The cows were out grazing, I believe. But the dogs were a terrible sight and a terrible commentary on our ideas of compassion. It would be far more merciful and a greater act of merit to put an end to the sufferings of the poor creatures, but if their lives must be prolonged, they should have proper treatment to alleviate their agony, if not to effect any kind of cure; also the less afflicted dogs should be kept separate. There is plenty of room to segregate the less unhealthy creatures from those in the last stages of living decay. The sheds and courtyards should be well fumigated and disinfected. Above all there should be no possibility of these wretched diseased little creatures perpetuating their kind. I am strongly for the separation of the male and female dogs as recommended in the letter written by Mrs. Jinnah and yourself, which moved me to go and see things for myself.

Yours sincerely,

· Sarojini Naidu."

These letters attracted the attention of the Government of Bombay and they asked the Chief Presidency Magistrate to look into our complaints and suggestions and to put matters right. This was done and Ruttie had the satisfaction to see that her efforts were not wasted.

One very vivid example of Ruttie's and my mind being in tune with each other: Owing to continuous ill-health she suffered from restlessness and sleeplessness though otherwise of a cheerful disposition, and this made her more ill and more tired; she asked me to help her. When I used to be with her she used to say: "I am very tired but I cannot sleep." All that I had to do was to say: "Ruttie, sleep", and hardly had I said this she was fast asleep. Sometimes, she would say: "Oh, if I sleep you will go away", I said: "I would not go, sleep, I will read a book", and the next moment I found her sleeping peacefully. When I was not with her she would ring me up late at night to say that she was tired and could not sleep. On the phone I would tell: "Go sleep, you will sleep." Next morning she would ring me up and thank me. The power of thought transference was as effective as coueism. I told Mrs. Besant that I was embarrassed that Ruttie looked up to me for everything, had great confidence in me and in my capacity and thought too highly of me and I knew I did not deserve all that. Mrs. Besant said that I should not worry about this as I would try to live up to the expectation that Ruttie had of me.

Ruttie was interested in my social and labour work. Both she and Jinnah encouraged me to do this work. She was a source of inspiration in my work and next to Mrs. Besant she was a most helpful and healthy influence on me and my work. She, Jinnah and I used to discuss my investigations in the brothel area and both of them took practical and realist point of view. What we were after was to reduce the cruelties and inhumanities of the "trade" and we did succeed to some extent. The Bombay Children's Act demanded by me in 1921 through a question in the Bombay Legislative Council was passed in 1924 and put in force in May, 1927. This legislation

inter-alia enabled us to remove children, boys and girls under 16, from unhealthy and immoral surroundings. During my investigations in 1921-22 I found hundreds of boys and girls in the brothel area, many of them already afflicted with venereal disease as we later discovered. By 1928 there was not a single child to be found living in the brothel area. The police helped us to remove them from the brothels to the Children's Home at Umerkhadi of which Miss Kathleen Davis was the indefatigable Secretary. Miss Davis lived inside the Children's Home and worked for over 15 hours a day.

The following letter (28th August, 1927) shows Ruttie's keen and deep interest in this work:

"I am sending you some Mangoostan. I don't know whether you are introduced already, but somehow I feel that you will like them.

"When are you going to take me round so that I may see for myself the conditions existent and the life lived by those poor women? Mind, the places I want to see are those commonly called 'brothels' and *not*, where the girls work independently.

"J. writes that he may be returning before the end of the sessions and that Simla is quite dull, but surely the Sandhurst Committee will be sitting to the end of September, won't it? However, they are evidently hurrying on as he adds that they have been very busy with it."

Ruttie wanted to see the living conditions of the brothel area at first hand, and Miss Davis, she and I toured round these for hours together, visiting one brothel after another.

In January, 1928, after their return from Calcutta, Ruttie and Jinnah separated. I cannot find fault with either for this separation, which was due to temperamental differences and difference in age. Their points of view on various aspects of life were different. I can assert from personal knowledge that even today, 33 years after her death, that she retained her affection for Jinnah. There was a rapprochement between them when Ruttie was seriously ill in Paris in August-September, 1928. Jinnah went to England on April 3, 1928. Ruttie followed a week later on 10th April. She went to Paris, got ill, entered a nursing home, so Jinnah followed, stayed with her in the nursing home for over a month and looked after and nursed her and as Ruttie told me later, he ate the same food as she did at the nursing home. They returned to India separately, she with her mother, but she was still very ill and I saw her practically every day between the middle of October right till her death on 20th February, 1929, except for the few days during the Christmas week, when Mrs. Besant called me to Calcutta to attend the All Parties Conference to discuss the Nehru (Motilal) Report. I did not want to go to Calcutta as I did not like to leave Ruttie alone—she was not keeping good health—but the telegram from Mrs. Besant was a "command" and I obeyed.

I received the following letter dated 30th November, 1928 from Krishnamurti:

"My dear Kanji,

I hope Mrs. Jinnah is very much better and please give her my love, if she will have such a thing from me. Also please tell her that I am thinking of her constantly. I hope she is better.

"I hope everything is well with you and your family.

"With much affection,

Krishna."

Throughout January and February, 1929, Ruttie continued to be ill and this depressed her. She hardly ever went out, except for short walks with me. Every evening Jinnah came to see her and Ruttie, Jinnah and I kept on talking as in the old times. They were getting reconciled to each other. Krishnamurti was to come to Bombay at the end of January and Ruttie asked me if I could bring him to tea on 1st February. Krishnamurti, his Secretary, Yadunandan Prasad and I met her at tea at 5 in the afternoon. I left at about 6.30 to keep another engagement, but Krishnamurti invited her to dinner for the 2nd February at the house of his host, my friend, Ratansi D. Morarji. Ruttie accepted for herself and for me and we had a most pleasant meeting with Krishnamurti again. On 13th February, Ruttie, my wife and I went to the cinema for the after dinner show. The Bombay riots were on then and as Honorary Presidency Magistrate I was on the night duty on 16th-17th February at Byculla. In the early morning I went to meet Mrs. Besant arriving from Madras at the station, then I lunched with her. As I went to my residence Ruttie came, terribly depressed and unhappy. She spent about 4 hours with me at my flat, then I took her home and she made tea for me. I could not leave her in that condition of terrific depression, so I did not go and have tea with Mrs. Besant as she had asked me to do. I left Ruttie at 7 promising to call back by 10.15 P.M. after I had seen Mrs. Besant off at the station. I

apologised to Mrs. Besant for having not met her at tea and told her that I had to be with Ruttie as she was feeling so unhappy. She asked me to look after her. When I got to Ruttie's place at 10.15 I discovered to my horror that she was unconscious. I was able to revive and awaken her. Next morning—18th February, she rang me up and asked me to see her on my way to office, she was still most depressed. I tried to comfort her as best as I could and as I was leaving her I said: "I'll see you to-night". She replied: "If I am alive. Look after my cats and don't give them away". These were the last words Ruttie spoke to me. I was dining out at Andheri that night and when I went to Ruttie's house at 11.15 P.M., I found her fast asleep. As I had not slept for continuously two nights I went home.

On the 19th afternoon I was informed by telephone that she was unconscious again and there was very little hope of her living. Immediately I called at her house, but could not see her. On the 20th February evening—her birthday—she passed away. Jinnah was away in Delhi for the Budget Session of the Assembly but returned to Bombay in time for the funeral on the 22nd. Col. and Mrs. Sokhey and I met him at the Grant Road Station. I was sitting beside Jinnah for all the five hours the funeral rites were performed. I knew that Ruttie would have liked to be cremated and I said so to Jinnah, but she was buried under Muslim rites.

Jinnah put up a brave face and after a tense silence, he began to talk hurriedly of his work in the Assembly a week before, and how he helped Vithalbhai Patel, the Speaker, out of the tight corner the latter had got into with Government. Then, as Ruttie's body was being lowered into the grave, Jinnah, as the nearest relative was

the first to throw the earth on the grave and he broke down suddenly and sobbed and wept like a child for minutes together. I followed Jinnah and looking for the last time through sorrowful and tearful eyes at the mortal remains of the lovely and beautiful immortal soul, I promised to Ruttie that one day I would write her full story and it has taken me more than thirty years to fulfil this promise. I dedicated to Ruttie my 85 page "Gandhiji through my Diary Leaves" (1915-1948), published in May 1950. Jinnah asked me to meet him the next evening as he knew that I was with Ruttie all through the weeks prior to her death.

Never have I found a man so sad and so bitter. He screamed his heart out, speaking to me for over two hours, myself listening to him patiently and sympathetically, occasionally putting a word here and there. Something I saw had snapped in him. The death of his wife was not just a sad event, nor just something to be grieved over, but he took it, this act of God, as a failure and a personal defeat in his life. I am afraid he never recovered right till the end of his life from this terrible shock.

Jinnah's personal and political life was as clean as clean can be and free from corruption. He bought "South Court", the house in Mount Pleasant Road, in 1916. It was a kind of Nineteenth Century country house and not modern. During the years after their marriage, "South Court" was my second home and I enjoyed the confidence and friendship of both Ruttie and Jinnah. I had great respect for Jinnah as my political leader in Bombay and as a friend. After his marriage with Ruttie in the spring of 1918, he had no separate existence away from his wife: He found in her a great source of inspiration. His personal, political and social

life was always with Ruttie. She was always with him, and though she was so much younger than he, she without his realising it, looked after him and made his life in all its aspects, pleasant, carefree and well worth living. Jinnah, after his marriage, resigned from the Orient Club where he used to play Chess and Billiards. He never played cards. He abhorred every kind of gambling and all games of chance.

Her death left Jinnah completely lonely. He never recovered from this loneliness, and this loneliness added to the bitterness of his life; and I must add that this bitterness, born out of this personal loss and disappointment travelled into his political life. This, I feel, is the correct analysis of Jinnah's political bitterness which lasted throughout the nineteen years that he lived after his wife's death, and influenced his political life and opinions. This is a sad sad story.

On his wife's death, Jinnah withdrew into his Ivory Tower and he became a perfect isolationist. From a cheerful, pleasant and social friend with a dry sense of humour, he became ego-centric and was sensitive to criticism. He could not stand abuse, ridicule, misunderstanding and misrepresentation of his actions and never forgave those, who, unwisely and unjustly indulged in them. His wife's death reacted on him so severely that never once during the remaining nineteen years of his life did he refer to her directly or indirectly or mention her name. I never saw Ruttie's photographs in his house. Ruttie had a beautiful collection of jades, rare artistic articles and first editions of books and they would have made an excellent Museum. But all that Jinnah did was to put them in boxes and forgot all about them.

It is futile to contemplate and speculate how Jinnah's

political life would have shaped if Ruttie had been by his side through the fateful thirties and forties. Ruttie was a great nationalist with no communal bias or prejudices. I have not the slightest doubt that if Ruttie had lived Jinnah would have asked her to go back to his house and she would have agreed and there would have been most perfect and full reconciliation between them. Every day Ruttie used to enquire from me how Jinnah was working in the Legislative Assembly, and whether the reports appearing in the Congress press that he was turning communal were true. She, the great nationalist, was disturbed about these reports. I assured her that Jinnah was not turning communal, that he was a staunch nationalist, and that the Congress leaders and the Congress press were mischievously misrepresenting him and

Ruttie kept herself away from participating in active politics, but was helpful to Jinnah and Jinnah, influenced by her, kept non-communal.

I received from Sarojini Naidu, who was then in America, the following letter on Ruttie's death:—

"Hotel Alonquin,
44th Street, West
New York City.
March 20, 1929.

"My dear Kanji,

I seem to be stricken dumb suddenly and all my strength has deserted me. The earth has been heavy over the beautiful face I loved, for a month and I only knew two days ago . . . . It was told to me in

a very casual way across the telephone by someone who did not know how dear was the little girl to me . . . . Why did you not send me a cable? But why did I not follow the impulsive instinct that was an intuition and send a cable myself . . . . on the 20th February which was the day of Ruttie's 29th birthday, I was overmastered by a sense of foreboding and fear, how I confused it . . . . it was a true fear and foreboding. But I would not let myself act foolishly as I said to myself. I wish I had . . . . My letter for her birthday must have reached India the week she passed away . . . . Poor child, poor wonderful stricken child.

"I am writing to send you a word of consolation as well as gratitude for all your loyal friendship and affection towards her. She valued this friendship, leaned on it and accepted its service. You were one of the few who realised how rare and brave and noble a spirit was hers whom most people could not value or understand aught . . . . Thank you—in her name for my sake . . . . because you knew how Ruttie was very close to my heart.

"There was no other way . . . . of liberation for her strong and suffering soul that always sought freedom. Her mother and her husband are both in my thoughts and I suffer with and in their loss and pain . . . . I send you my affectionate feelings. Be worthy always of this love and friendship she gave you.

Sarojini Naidu."

I received the following letter from Krishnamurti, dated 1st April, 1929:—

"Arya Vihar, Ojai, California.

"My dear Kanji,

I ought to have written to you sooner and I am sorry not to have done so.

"It must have been terrible for you and I am so grieved about it. Poor Mrs. Jinnah. I thought she would get well, when we last saw her. She looked so much better. I have been thinking of her so often, since your cable and I am very sorry about it all and for her. I am glad she did not suffer too much in the end. You must miss her very much and you have, if I may say so, my greatest sympathy.

"I hope everything is going on well. Please give my love to your wife and Chanda.

"With much love to yourself,

Krishna."

Ruttie was a woman of great character, beauty, grace and magnanimity. She was a woman of great understanding. She was a most devoted friend.

ضمیمہ نمبر

کانجی دوارکاداس اور قائداعظم محمد علی جناح کے درمیان خط کتابت کا سلسلہ ایک طویل عرصہ تک جاری رہا۔ جن میں سے تین خطوط قائداعظم پیپرز پروجیکٹ، کلچر ڈویژن گورنمنٹ آف پاکستان اسلام آباد کے مرتب کردہ جناح پیپرز کی مختلف جلدوں میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں جبکہ ایک خط قائداعظم پیپرز کی غیر مطبوعہ فائل نمبر 1083 (مملوکہ قائداعظم اکیڈمی، کراچی) میں موجود ہے۔ ان ابتدائی تین خطوط کا متن اور چوتھے خط کا عکس آپ کے مطالعہ کے لیے حاضر ہے۔

(1)

Kanji Dwarkadas to M. A. Jinnah

F. 508/1-2

BOMBAY,
25 December 1944

My dear Jinnah,

I send you my very very best wishes. I recall to my mind that I first met you in 1916, and I always consider it a great privilege that I worked with you in close contact during the Home Rule League years and during 1920-1930.

My one big prayer is that by the time you celebrate your birthday next year, a healthy settlement will have been arrived at between the two big communities. It is curious but it is a fact that Hindus in this country look to you for leadership, and today you have as many Hindus as Musalmans as political and personal friends. Your opportunity, as your responsibility, is great and the best wishes of humble friends like me are with you.

Once again with my very best wishes,

Yours sincerely,
KANJI DWARKADAS

(2)

Kanji Dwarkadas to M.A. Jinnah

F. 508/3

ALTAMONT ROAD,
CUMBALLA HILL,
BOMBAY,
7 November 1945

My dear Jinnah,

Enclosed is a copy of my letter to the [*Bombay*] *Chronicle* which I handed over personally to [S.A.] Brelvi[1] this afternoon. He has promised to publish it at an early date.

I do not think you have seen my pamphlet *Housing Indian Labour*. Here is a copy.[2]

With kindest regards,

Yours sincerely,
KANJI DWARKADAS

[1]Editor of the *Bombay Chronicle*, a weekly magazine.
[2]See F.508/6-25, *QAP*. Not printed.

Enclosure
Kanji Dwarkadas to S. A. Brelvi

F. 508/4-5

7 November 1945

Sir,

Will you please let me correct a misstatement which appeared in Birbal's notes in the *Chronicle* of 3rd November. He says that about two decades ago Mr. Hooseinbhoy Lalljee, who was contesting the election for the Muslim seat from the City for the Central Legislative Assembly, withdrew in favour of Mr. Jinnah in spite of the fact that he was winning the election. This is not true. These are the facts: There were three candidates—Mr. Jinnah, Mr. Salebhoy Barodawalla, and Mr. Hooseinbhoy Lalljee. By ten in the morning there was no doubt as to what the result would be; for every ten votes that Mr. Jinnah was getting, the other two candidates were hardly getting four. Before mid-day, Mr. Barodawalla approached Mr. Jinnah and suggested that Mr. Jinnah should request him to withdraw, as then it would make it easy for him to withdraw. Mr. Jinnah very politely said that it was not for him to ask him to withdraw and he did not mind his carrying on the fight till the end of the day. Within half an hour Mr. Barodawalla withdrew. A little later Mr. Hooseinbhoy Lalljee, who realised that Mr. Jinnah was scoring heavily, approached him with a request that he might be asked to withdraw. Mr. Jinnah told him to carry on and he would not ask him to withdraw. Votes were recorded right till late in the afternoon and Mr. Jinnah had a thumping majority against the two other candidates.

The name Birbal connotes a sense of humour and sense of proportion, an objective observer's point of view and fair-mindedness. I am afraid in the midst of the unfortunate political controversies of the day in India, Birbal is unfair to the name he has adopted. As it is, there are enough dissensions and personal bickerings in the country. Is it right to make them worse by making statements which are not true? Surely Birbal could check up and verify his information.

Yours etc.,
KANJI DWARKADAS

(3)

Kanji Dwarkadas[1] *to M. A. Jinnah*

F. 120 (Vol. III)-GG/59

34 ALTAMONT ROAD,
CUMBALLA HILL,
BOMBAY,
16 December 1947

My dear Quaid-i-Azam,

You will be interested in my letter on the Matunga Labour Camp which appeared in the *Times of India* and the *Evening News*. I am enclosing a copy.[2] The Camp is populated by *Harijans* and I should like to draw your attention to the last paragraph of the letter.

I hope you are enjoying the best of health. I am going to Madras for a short holiday as the guest of the Governor of Madras and Lady Nye. I shall also meet Krishnaji who has returned to India after 8 years from the USA.

Next week your birthday comes and I take this opportunity of sending you my very very best wishes for your good health and for *the success of the Pakistan Government and for peace, friendship and co-operation between the two Dominions*.[3] The world situation is getting more and more serious and it is best that the two Dominions should work in friendship and mutual co-operation. Unimportant, insignificant as I may be, I would like to put myself entirely at the disposal of those who are working for peace and harmony and happiness of the people.

With kindest regards,

Yours sincerely,
KANJI DWARKADAS

[1]Author of *Ruttie Jinnah—The Story of A Great Friendship*.
[2]See F. 120 (Vol. III)-GG/60. Not printed.
[3]Sidelined in the original.

(4)

E. D. SASSOON & COMPANY, LTD.,

JACOB SASSOON MILLS BUILDING,
SUPARIBAUG ROAD, PAREL
BOMBAY.

QAP 1083

17th January 1939.

My dear Jinnah,

I shall be extremely obliged if you will kindly send me 3 copies of the Pamphlet published by the Muslim League regarding the grievances of the Mohammedans against the Congress. I hope you will not my giving you this trouble.

Trusting you are well and with kind regards,

Yours sincerely,
Kanji Dwarkadas

حوالہ جات:

1- جناح پیپرز، سیکنڈ سیریز،
جلد 12، صفحہ 312، 313۔
2- جناح پیپرز، سیکنڈ سیریز،
جلد 11، صفحہ 369، 370۔
3- جناح پیپرز، فرسٹ سیریز،
جلد 6، صفحہ 460۔
4- قائداعظم پیپرز،
فائل نمبر 1083، صفحہ 40
(غیر مطبوعہ)

کانجی دوآرکاداس



کانجی دوآرکاداس یکم مئی 1892ء کو پیدا ہوئے تھے۔ بیس، پچیس برس کی عمر سے ہی انہیں عملی سیاست اور سماجی بہبود سے دلچسپی رہی اور وہ 1921ء سے 1923ء تک مزدوروں کے نمائندے کے طور پر بمبئی کی مجلس قانون ساز کے رکن رہے۔ ان کی کوششوں سے اس اسمبلی میں مزدوروں، پیشہ ور عورتوں اور بے گھر اور آوارہ گرد بچوں کی بہبودی کی خاطر کئی قوانین منظور ہوئے۔ وہ 1919ء میں قائم ہونے والی آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے اساسی رکن تھے، اور 26-1925ء میں اس تنظیم کے خازن رہے تھے۔ وہ 1922ء سے 1935ء تک بمبئی میونسپل کارپوریشن کے رکن رہے۔ وہ اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس اور ہوم رول لیگ کے رکن رہے، جب قائداعظم محمد علی جناح بھی ان دونوں سیاسی جماعتوں سے وابستہ تھے۔

کانجی دوآرکاداس کا ایک حوالہ صحافت بھی رہا۔ ابتدا میں وہ ڈاکٹر اینی بیسنٹ کے اخبار نیو انڈیا کے اعزازی نامہ نگار رہے بعدازاں وہ اس اخبار کے نائب مدیر بھی مقرر ہوئے۔

کانجی دوآرکاداس نے نہ صرف ہندوستانی سیاست میں خود بھی فعال حصہ لیا بلکہ اس کے کئی سیاسی کرداروں کے قریب بھی رہے۔ وہ ہندوستانی سیاست کے کئی اہم واقعات کے عینی شاہد بھی رہے اور ان میں شریک بھی رہے۔ کانجی دوآرکاداس نے سیاست کے موضوع پر کئی کتابیں تحریر کیں جن میں Ten Years to India`s Fight for Freedom، Freedom اور Gandhiji:Through My Diary Leaves-1915-48 کے نام سرفہرست ہیں۔ وہ مزدوروں کے مسائل پر لکھی گئی 8 کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

شہاب الدین دسنوی



ابوالکمال عبدالحکیم دسنوی کے بعد سید شہاب الدین دسنوی دوسرے اہل قلم تھے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنے وطن دیسنہ کی نسبت لگا کر علم وادب کی خدمت کو شعار بنایا۔

شہاب الدین دسنوی 6 جولائی 1913ء کو صوبہ بہار کے مردم خیز خطے دیسنہ میں پیدا ہوئے تھی۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے بی ایس سی کی سند حاصل کرنے کے بعد وہ بمبئی چلے گئے جہاں انہوں نے انجمن اسلام ہائی اسکول میں استاد کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ چند برس بعد وہ حاجی صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہوگئے۔ ان کی اپنی غیر معمولی انتظامی صلاحیت اوران تھک محنت کی بدولت جب اس انسٹی ٹیوٹ کو پولی ٹیکنیک کا درجہ ملا تو انہیں اس ادارے کا پہلا پرنسپل مقرر کیا گیا۔

شہاب الدین دسنوی متعدد اداروں میں اہم تنظیمی عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی ایک اور وجہ شہرت ان کی تصانیف ہیں، جن میں انجمن اسلام کے سو سال، آئن اسٹائن کی کہانی، شبلی، معاندانہ تنقید کی روشنی میں، کیمیا کی کہانی اور ہمارا دین کے نام سرفہرست ہیں۔ وہ ایک افسانہ نگار بھی تھے اوران کے افسانوں کا مجموعہ پہلو بہ پہلو کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان کی مختصر خودنوشت سوانح عمری دیدہ وشنیدہ کے نام سے شائع ہوئی۔ زیر نظر کتاب محمد علی جناح بھی ان کی تحقیق اور ترجمے کا شاہکار ہے۔ انہوں نے یہ کتاب قائداعظم کے دیرینہ دوست کانجی دوارکاداس کی دو کتابوں India's Fight for Freedom اور Ten Years to Freedom کے منتخب حصوں کو باہم مربوط کر کے مرتب کی ہے۔

شہاب الدین دسنوی نے 30 مارچ 1998ء کو پٹنہ میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

عقیل عباس جعفری



عقیل عباس جعفری کا نام تحقیق کے شعبے میں نیا نہیں۔ انہوں نے ابتداء معلومات عامہ کے شعبے سے کی اور اس حوالے سے کئی کتابیں تحریر کیں جن میں 366 دن، صفر سے سو تک، جہان معلومات، ہے حقیقت کچھ......، ایک سال پچاس سوال، کون بنے گا کروڑ پتی؟ اور قائداعظم معلومات کے آئینے میں'' شامل ہیں۔

''پاکستان کے سیاسی وڈیرے'' پاکستانیات کے موضوع پر ان کی پہلی کتاب تھی۔ یہی وہ کتاب تھی جس نے سیاست کی دنیا میں ''سیاسی وڈیرے'' کی اصطلاح کو متعارف کروایا۔ بعدازاں عقیل عباس جعفری نے پاکستانیات ہی کے موضوع پر کئی اور کتابیں بھی لکھیں جن میں پاکستان کی ناکام سازشیں، پاکستان کی انتخابی سیاست، قائداعظم کی ازدواجی زندگی، لیاقت علی خان قتل کیس، پاکستان کا قومی ترانہ: کیا ہے حقیقت، کیا ہے فسانہ؟ اور پاکستان کرونیکل شامل ہیں۔ وہ شاہد احمد دہلوی کے موسیقی کے موضوع پر لکھے گئے مضامین بھی مضامین موسیقی کے نام سے مرتب کر چکے ہیں۔

عقیل عباس جعفری ایک خوش گو شاعر بھی ہیں۔ وہ 2000ء میں ریڈیو پاکستان کا بہترین نعت گو اور بہترین قومی نغمہ نگار کا ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے راستا اور تر وتازہ کے نام سے زیر اشاعت ہیں۔

تحقیق اور پاکستانیات کے شعبے میں ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کوئز سوسائٹی نے انہیں کوئز ایکسیلینس ایوارڈ، وزڈم پاکستان فورم نے ہیروز آف پاکستان کمال کارکردگی ایوارڈ اور سینٹر آف سوک ایجوکیشن پاکستان نے سوک ایجوکیشن ایوارڈ عطا کیے ہیں۔

کیا جناح پاکستان چاہتے تھے؟

"میں سمجھتا ہوں کہ جناح پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ 1946ء تک وہ متحدہ ہندوستان کے لیے کام کرنے پر تیار تھے۔ میرے خیال میں وہ پاکستان کا مطالبہ پیش کر کے مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اگر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کانگریسی لیڈران سے کوئی سمجھوتا کرنا نہیں چاہتے تھے تو اس میں حق بجانب تھے۔ جب کبھی کانگریسی رہنماؤں نے یہ دیکھا کہ برطانیہ سمجھوتے پر آمادہ ہو رہا ہے تو ان کے ذہن میں جناح کو نظر انداز کر دینے کا خیال فوراً آجاتا تھا۔ کانگریسی لیڈر سمجھتے تھے کہ ہندو مسلمان مسئلے کو کانگریس جناح اور مسلم لیگ نہیں بلکہ صرف کانگریس اور برطانیہ حل کر سکیں گے۔

ہندوستان تقسیم ہو گیا، بھارت اور پاکستان دو مملکتیں بن گئیں۔ جناح نے پاکستان نہیں جیتا...... کانگریسی لیڈر، نہرو اور پٹیل، جناح کو پاکستان ہار بیٹھے!"

(زیر نظر کتاب سے ایک اقتباس، صفحہ: 113)

ISBN 9789699454080

Rs.350/=